

جانان جاناں

احمد علی

مئے کا بیت

حسامی بک ڈپو پھلی کمان حیدر آباد

جانانِ جانان

احمد فراز

جنوری ۱۹۸۱ء

قیمت: ۵۰-۸ آٹھ روپے چاس پیسے

— ملنے کا پتہ —

حسامی بک ڈپو

مچھلی کمان، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

فہرست

- | | |
|---|----|
| یہ میری نظمیں یہ میری غزلیں | ۱ |
| اُس کے تجرید و وفا کا نہیں امکان جاناں | ۲ |
| اے خدا جو بھی مجھے بند کیجی بانی دے | ۳ |
| اب کے رُت بدلی تو خوشبو کا سفر دیکھے گا کون | ۴ |
| خواب مرتے نہیں | ۵ |
| ہر خواب عذاب ہو چکا ہے | ۶ |
| یوں تو پہلے بھی ہوئے اس سے کئی بار خدا | ۷ |
| جو رنجشیں تھیں جو دل میں غبار تھا نہ گیا | ۸ |
| جو بھی درونِ دل ہے وہ باہر نہ آئے گا | ۹ |
| مت سوچو ! | ۱۰ |
| سنا تو ہے کہ نگارِ بہار راہِ پیاسے | ۱۱ |
| سب لوگ لئے سنگِ ملامت نکل آئے | ۱۲ |

- ۱۳ اب کس کا جشن مناتے ہو
- ۱۴ اب بہار اب کے بھی برسا پر سے چوے
- ۱۵ شگفتہ دل ہیں کہ
- ۱۶ دل گرفتہ ہی سہی
- ۱۷ ستم کا آشنا
- ۱۸ لے مرے یار قدح ریز
- ۱۹ کہا تھا کس نے کہ عہدِ وفا کرو اس سے
- ۲۰ تجھ سے بھڑکے ہم بھی تقدیر کے ہو گئے
- ۲۱ ہر تماشا فی فقط ساحل سے منظر دیکھنا
- ۲۲ سحر کے سورج !
- ۲۳ وہ تو سب درد کے لمبے تھے
- ۲۴ سوئے فلک نہ جانبِ مہتاب دیکھنا
- ۲۵ ستمگری کا ہر اندازِ محرومانہ لگا
- ۲۶ جو سزا ہم کو ملے
- ۲۷ آرزو گاہِ شہر کا جیسا بھی حال ہو
- ۲۸ تری یاد دل کا وہ عالم نہیں ہے

- ۲۹ برسوں کے بعد دیکھا ایک شخص دیر باسا
- ۳۰ جسم شعلہ ہے جھبی جامہ سادہ پہنا
- ۳۱ سچ بھی جھوٹا ہے
- ۳۲ میں نے آغاز سے انجام سفر جانا ہے
- ۳۳ میں کہ پھر دشتِ رفاقت کا سفر کر آیا
- ۳۴ ہاتھ اٹھاتے ہیں مگر لب پر دعا کوئی نہیں
- ۳۵ تو بہتر ہے یہی !
- ۳۶ یہ جو نشے میں سفر کے نہ اتر جائیں کہیں
- ۳۷ آنسو نہ روک دامنِ زخم جگر نہ کھول
- ۳۸ عجب جنوںِ مسافت میں گھر سے نکلا تھا
- ۳۹ تیری میرا
- ۴۰ طعنہ زن تھا ہر کوئی ہم پر دلِ ناداں سمیت
- ۴۱ میں تو لبِ کھول کے پابند سلاسل ٹھہرا
- ۴۲ اس دورِ بے جنوں کی کہانی کوئی لکھو
- ۴۳ قلم سرخرو ہے !
- ۴۴ آتے تری محفل میں تو بے تاب بہت تھے

- ۴۵ وفا کے خواب محبت کا آسرا لے جا
- ۴۶ دست بھی دشمن نہ تھے دل بھی عدو میرا نہ تھا
- ۴۷ خاک نایح !
- ۴۸ جس سمت بھی دیکھوں نظر آتا ہے کہ تم ہو
- ۴۹ لوحہ گروں میں دیدہ تر بھی اسی کا تھا
- ۵۰ زلف راتوں سی ہے رنگت ہے اجالوں جیسی
- ۵۱ عید کارڈ
- ۵۲ نہ دل سے آہ نہ لب سے صدا نکلتی ہے
- ۵۳ ہنسے تو آنکھ سے آنسو رواں ہمارے ہوتے
- ۵۴ فرآز اب کوئی سودا کوئی جنوں بھی نہیں
- ۵۵ میور کا !
- ۵۶ تخی مرے جام میں وروے تنہائی بہت
- ۵۷ جو قربتوں کے نشے تھے وہ اب اترنے لگے
- ۵۸ انہیں خوش گمانیوں میں کہیں جاں سے بھی نہ جاؤ
- ۵۹ طعنہ زن کیوں ہے مری بے سرو سامانی پر
- ۶۰ اہل تاشقند کے نام !

- ۶۱ خود آپ اپنی نظر میں حقیر ہیں، بھی نہ تھا
- ۶۲ یوں تو محروم نواکب سے دہن میرا تھا
- ۶۳ ہوا کے زور سے پندارِ بام و در بھی گیا
- ۶۴ ہر دوا درد کو بڑھا ہی دے
- ۶۵ کہا نہیں تھا !
- ۶۶ قامت کو تیرے سر و صوبہ نہیں کہا
- ۶۷ اتنا بے رنگ دکھ کو نہیں جلیے ہر رنگ جاں شعاعِ بدن ہو گی
- ۶۸ میں ترا قاتل ہوں !
- ۶۹ جو سر بھی کشیدہ ہوا سے دار کر ہے
- ۷۰ کشیدہ سر سے توقعِ عبت جھکاؤ کی تھی
- ۷۱ ہر کوئی جاتی ہوئی رت کا اشارہ جانے
- ۷۲ میں اکیلا کھڑا ہوں !
- ۷۳ سلام آس پر !
- ۷۴ گلیوں میں کیسا شور تھا کیوں بھڑسی مقتل میں تھی

یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں

یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں
 یہ تذکرے تریے لطف کے ہیں
 میں سب تری نذر کر رہا ہوں
 جو زندگی کے نئے سفر میں
 تو ایک اک حرف سرجی اٹھے گا
 اداس تنہائیوں کے لمحوں
 مجھے ترے درد کے علاوہ بھی
 ہزار غم تھے جو زندگی کی!
 مجھے خبر تھی کہ تیرے آئینہ میں
 مگر ہر اک بار تجھ کو جھوکر
 یہ زخم گلزار بن گئے ہیں
 یہ درد موج صبا ہوا ہے
 تمام تیری حکایتیں ہیں
 یہ شعری تیری شکایتیں ہیں
 یہ ان زمانوں کی ساعین ہیں
 تجھے کسی وقت یاد آئیں
 پہن کے انفاس کی قبا ہیں
 میں ناپ اٹھیں گی یہ ایسے ہیں
 اور دکھ تھے یہ مانتا ہوں
 تلاش میں تھے یہ جانتا ہوں
 درد کی ریت چھانتا ہوں
 یہ ریت رنگِ حبِ نبی ہے
 یہ آہ سوزاں گھٹا نبی ہے
 یہ آگ دل کی صدا نبی ہے

اور اب یہ ساری متاعِ ہستی یہ بھول یہ زخمِ سب ترے ہیں
 یہ دکھ گئے تو ہے یہ سکھ کے نغمے جو کل مرے تھے وہ اب ترے ہیں
 جو تیری قربت تری جدائی میں کٹ گئے روز و شب ترے ہیں
 وہ تیرا شاعرِ ترا مغنی وہ جس کی باتیں عجیب سی تھیں
 وہ جس کے اندازِ خسروانہ تھے اور ادائیں غریب سی تھیں
 وہ جس کے سینے کی خواہشیں بڑی خود اس کے اپنے نصیب سی تھیں
 نہ پوچھو اس کا کہ وہ دیوانہ بہت دنوں کا آجڑ چکا ہے
 وہ کوہن تو نہیں تھا لیکن کڑی چٹانوں سے لڑ چکا ہے

وہ تھک چکا تھا اور اس کا تیشہ
 اسی کے سینے میں گر چکا ہے



اب کے تجرید و فسا کا نہیں امکاں جاناں
 یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیماں جاناں
 یوں نہی موسم کی آواز بچھ کے یاد آیا ہے
 کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انسان جاناں
 زندگی تیری عطا تھی سو ترے نام کی ہے
 ہسٹم نے جیسے جی بسر کی ترا احساں جاناں
 دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہو فُسرہ تو بھی
 دل کی کیا بات کریں دل تو ہے ناواں جاناں
 "حق"

اول اول کی محبت کے نشے یاد تو گر:
 بے پیئے بھی ترا چہرہ تھا گلستاں جاناں

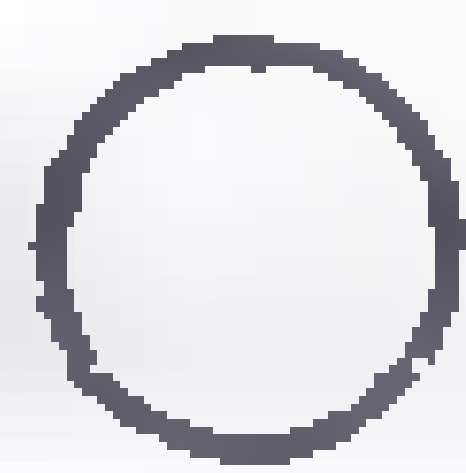
آخر آخر تو یہ عالم ہے کہ اب ہوش نہیں
 رگ مینا سلگ اٹھی کہ رگ جاں جاناں
 مدتوں سے یہی عالم نہ توقع نہ امید
 دل پیکارے ہی چلا جاتا ہے جاناں جاناں
 ہم بھی کیا سادہ تھے ہم نے بھی سمجھ رکھا تھا
 غم و درال سے جدا ہے غم جاناں جاناں
 اب کے کچھ ایسی سبھی محفل یاراں جاناں
 سر بہ زانو ہے کوئی سر بگریباں جاناں
 ہر کوئی اپنی ہی آواز سے کانپ اٹھتا ہے
 ہر کوئی اپنے ہی سانس سے ہراساں جاناں
 جس کو دیکھو وہی زنجیر پیا لگتا ہے
 شہر کا شہر ہوا داخل زنداں جاناں
 اب ترا ذکر بھی شانہ ہی غزل میں آئے
 اور سے اور ہوئے درد کے عنوان جاناں

ہم کہ روٹھی ہوئی رت کو بھی نہالیتے تھے
 ہم نے دیکھا ہی نہ تھا موسم ہجراں جاناں
 ہوش آیا تو سبھی خواب تھے ریزہ ریزہ
 جیسے اڑتے ہوئے اوراقِ پریشاں جاناں



اے خدا جو بھی مجھے پند شکیبائی دے
 آس کی آنکھوں کو مرے زخم کی گہرائی دے
 تیرے لوگوں سے گلہ ہے مرے آئینوں کو
 ان کو تختہ نہیں دیتا ہے تو بینائی دے
 جس کے ایما پہ کیا ترک تعلق سب سے
 اب وہی شخص مجھے طعنت نہائی دے
 یہ دہن زخم کی صورت ہے میرے چہرے پر
 یا میرے زخم کو بھریا مجھے گویائی دے

اتنا بے ہوش نہ جائے مگر کاجلیٹ
 چشم گریاں نہ سہی چشم تماشاں سے
 جن کو پیسراہن تو قیرو شرف بخشا ہے
 وہ برہنہ ہیں انہیں خلعتِ سواری سے
 کیا خبر تجھ کو کہ کس وضع کا بسمل ہے سراز
 وہ تو قسائل کو بھی الزام سبجائی سے



ابس کے رت بدلی تو خوشبو کا سفر دیکھے گا کون
 زخم بکھڑوں کی طرح ہرکس گے پردیکھے گا کون
 دیکھنا سب رقص بسمل میں مگن ہو جائیں گے
 جس طرف سے تیر آئے گا ادھر دیکھے گا کون
 زخم جتنے بھی تھے سب منسوبِ قاتل سے ہوئے
 نیکر ہاتھوں کے نشان آئے جاہ گردیکھے گا کون

وہ ہوس ہو یا وفسا ہو بات عمری کی ہے
 لوگ تو بھیل بھول دیکھیں گے شجر دیکھے گا کون
 میری آوازوں کے سائے میرے بام و در پہ ہیں
 میرے نغموں میں آ کر میرا گھر دیکھے گا کون
 ہم چراغِ شب ہی جب ٹھہرے تو پھر کیا سوچنا
 رات تھی کس کا مقتدر اور سر دیکھے گا کون
 اہ قریب شہر سے دیکھیں غنیم شہر کو
 شہر حلتا ہو تو نچھ کو بام پر دیکھے گا کون
 ہر کوئی اپنی ہوا میں مست پھرنا ہے فراز
 شہرِ نابرساں میں تیری چشم تر دیکھے گا کون



خوابُ مرتے نہیں

خوابُ مرتے نہیں

خوابِ دل ہیں نہ آنکھیں نہ سانس ہیں کہ جو

ریزہ ریزہ ہوئے تو بکھر جائیں گے

جسم کی موت سے یہ بھی مر جائیں گے

خوابُ مرتے نہیں

خوابُ نورِ روشنی ہیں نواہیں، ہوا ہیں

جو کالے پہاڑوں سے رکتے نہیں

ظلم کے دوزخوں سے بھی چھٹکتے نہیں

روشنی اور نوا اور ہوا کے علم

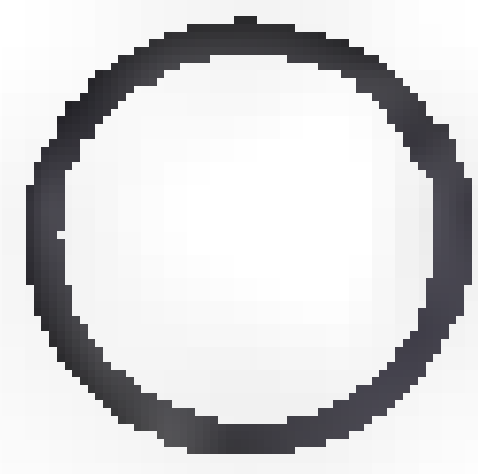
مقتلوں میں پیسج کر بھی جھکتے نہیں

خوابُ زحرف ہیں

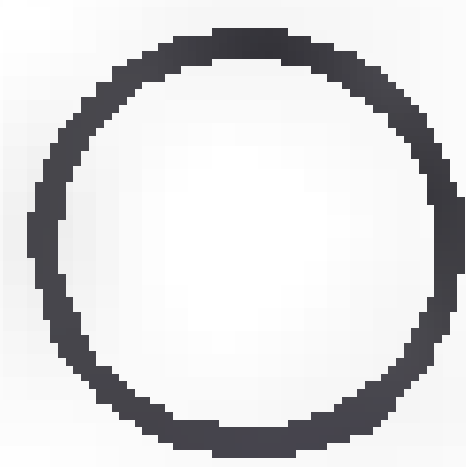
خوابُ تو نور ہیں

خوابُ سقراط ہیں

خوابُ منہور ہیں :



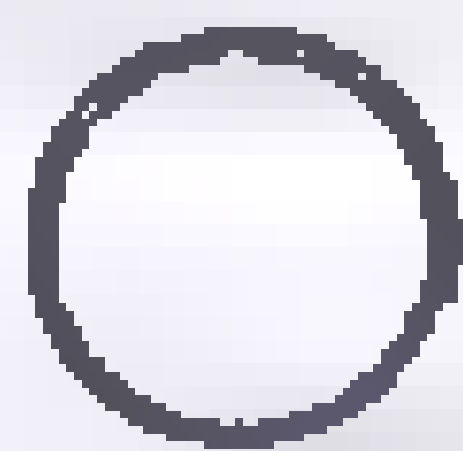
ہر خواب عذاب ہو چکا ہے اور تو بھی تو خواب ہو چکا ہے
 اب تختِ ریگ سے یہ چہرہ دریا تھا سراب ہو چکا ہے
 اب تو ترکِ وفا کا وقت آیا تو میرا جواب ہو چکا ہے
 اب اور کوئی علاج غم کا اب زہر شراب ہو چکا ہے
 اس رت میں بھی بے نوم ہو جائیں کانٹا بھی گلاب ہو چکا ہے

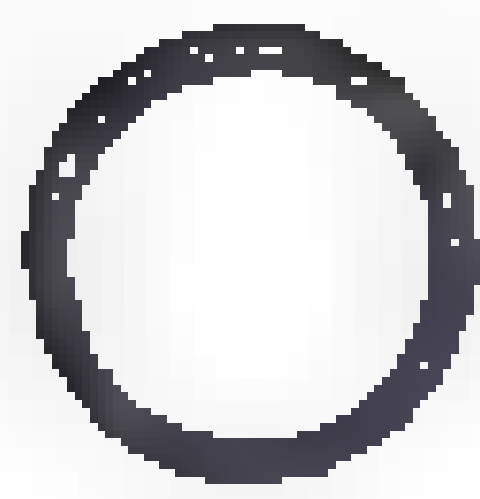


یوں تو پہلے بھی ہوئے اس سے کئی بار جدا
 لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جدا
 گر غمِ سود و زیاں ہے تو کھٹہر جائے جاں
 کہ اسی موڑ پہ یاروں سے ہوئے یار جدا
 دو گھڑی اس سے رہو دور تو یوں لگتا ہے
 جس طرح سایہ دیوار سے دیوار جدا

یہ جدائی کی گھڑی ہے کہ جھڑی ساون کی
 تہی جد اگر یہ کٹناں، ابر جد ایا رحبدا،
 کجکلا ہوں سے کہے کون کہائے بے خبر و
 طوق گردن سے نہیں طرہ دستار جدا
 اس قدر روپ ہیں یاروں کے کہ خوف آتا ہے
 سر میخانہ جدا اور سر دبار جدا

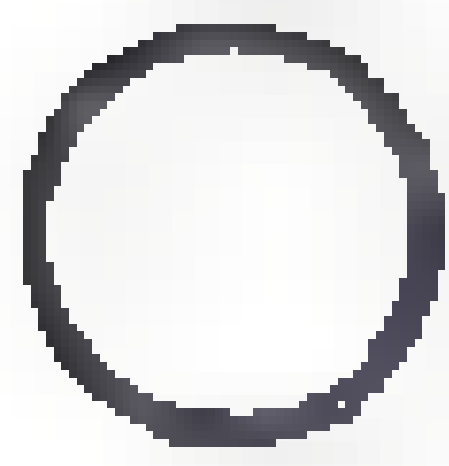
کوئے جانان میں کھلی خاصا تھا طرہ دار سراز
 یہ کن اس شخص کی سچ و سچ قہمی سر دار جدا





جورِ بخششیں تھیں جو دل میں غبار تھا نہ گیا
 کہ اب کی بار گلے مل کے بھی گلہ نہ گیا
 اب اس کے وعدہ فردا کو بھی ترستے ہیں
 کل اس کی بات پہ کیوں اعتبار آ نہ گیا
 اب اس کے بھر میں روئیں نہ وصل میں خوشیاں
 وہ دوست ہو بھی تو سمجھو کہ دوستانہ گیا
 نگاہِ یار کا کیا ہے ہوتی ہوئی نہ ہوتی
 یہ دل کا دروہ ہے پیار سے گیا گیا

سمجھی کو جہانِ تھنی پیاری سمجھی تھے لبستہ
 بس اک فسراڑ تھا ظالم سے چپ ہا نہ گیا



جو بھی درونِ دل ہے وہ باہر نہ آئے گا
 اب آگہی کا زہر زباں پر نہ آئے گا
 اب کے پھڑکے اس کو ندامت تھی ہر قدر
 جی چاہتا بھی ہو تو پلٹ کر نہ آئے گا
 یوں پھر رہا ہے کالج کا پیکر لئے ہوئے
 غافل کو یہ گمساں ہے کہ پتھر نہ آئے گا
 پھر بڑھا ہوں آج انہیں ساحلوں پہ پھول
 پھر جیسے موج میں یہ سمندر نہ آئے گا
 میں جہاں بلب ہوں ترکِ تعلق کے زہر سے
 وہ مطمئن کہ حرف تو اس پر نہ آئے گا

میت سوچو!

اور اس نے

مرے سا غریب

مے سُرخ انڈیلی — تو کہا

میت سوچو!

تم یہاں آئے ہو

اس ملک کے

اس شہر کے

اس جملہ تسکین میں جہاں

سب کے سب رقص کناں

نغمہ رباب

میت ادا میت سوچو

جاگتی رات

کے چہرے پر یہ ہے خوشبو کی روا

مُت سوچو

نم بکھی کیا لوگ ہو

پرویس بھی آتے ہو

تو لے آتے ہو

بیمار شب و روز و دل افسار

عزیزانِ وطن کی یادیں

اپنی نرویدہ و بوسیدہ قمیصوں کی طرح

جن کے دھبوں کو تو

خود کار شینیں بھی نہیں دھو سکتیں

یہ جو رنگار ہیں غریبے

خود آزار جو تاریکیاں ذہنوں کی ہیں

آلشیں سبوں کی ہیں

اس طرح سنھالے ہوئے پھرتے ہو

کہ جیسے یہ تمہارے دل و جاں ہوں
 اس گھڑی تم ہو جہاں
 مملکت خواب نہیں
 یاں کسی سوچ کا گرداب نہیں
 زندگی سنے کی طرح
 شوخ ہے طرار ہے
 زہرا اب نہیں
 اپنے کشکول کو دھلیڑ پر رکھ آؤ
 کہ درِ یوزہ گری
 اس جگہ شامل آداب نہیں
 منت سوچو!





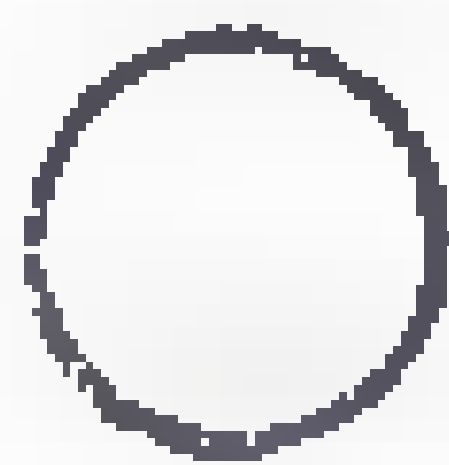
سنا تو ہے کہ نیگار بہار راہ میں ہے
 سفر بخیر کہ دشمن ہزار راہ میں ہے

گزر رہی بہارِ فہم بہت و فہم جہاں سے کہ یہ
 دُہ مضمحل ہیں اُن کی کہ بن کا شمار راہِ پیاسہ ہے

تیز تیز رہ رہ رہا اکیلی جہاں ممکن
 نہرا تیز رہ کہ بنا کا غیبِ ار راہِ پیاسہ ہے
 کہ وہ کہ کھپساں کہ کوئی غیبِ تو کہ ہے
 اکیلی غیبِ مہم رہ رہ رہا کہ راہِ پیاسہ ہے

نہ جہانے کب کا پہنچ بھی چکا سر منزل
وہ شخص جس کا ہمیں انتظارِ راہ میں ہے

فسرازا گرچہ کڑی ہے زمین آتش کی
”ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے“



سب لوگ لئے سنگِ طامت نکل آئے
کس شہر میں یا ہم اہلِ محبت نکل آئے

اب دل کی تمنا ہے تو اسے کاشیں دیں ہو
آنسو کی جگہ آنکھ سے حسرت نکل آئے

ہر گھر کا دیا گل نہ کرو تم کہ بھانے
کسی بام سے خورشیدِ نیامنت نکل آئے

جو درپتے پندار ہیں اُن قتل گہوں سے
 جاں دے کے بھی سمجھو کہ سلامت نکل آئے
 اے ہم نفسو کچھ تو کہو عہدِ ستم کی
 اک حرف سے ممکن ہے حکایتِ نکل آئے
 یارو مجھے مصلوب کرو تم کہ میرے بعد
 شاید کہ تمہارا قد و قامت نکل آئے



اب کس کا جشن مناتے ہو

اب کس کا جشن مناتے ہو	اُس دیس کا جو تقسیم ہوا
اب کس کا گیت سناتے ہو	اُس نثر من کا جو دردِ نیم ہوا
اُس خواب کا جو ریزہ ریزہ	ان آنکھوں کی تقدیر ہوا
اُس نام کا جو ٹکڑے ٹکڑے	گلیوں میں بے توقیر ہوا

اُس پر حسیں کا جس کی حرمت
بازاروں میں نیلام ہوئی
اُس مٹی کا جس کی حرمت
منسوب عکروں کے نام ہوئی

اُس جنگ کا جو تم ہار چکے
اُس رسم کا جو جاری بھی نہیں
اُس زخم کا جو سینے پہ نہ تھا
اُس جہان کا جو وار کی بھی نہیں

اُس خون کا جو بد قسمت تھا
اُس پھول کا جو بے قیمت تھا
راہوں میں بہا یا تن ہیں رہا
آنکھوں میں کھلا یا بن ہیں رہا

اُس مشرق کا جس کا تم نے
اُس مغرب کا جس کو تم نے
نیرے کی آنی مرہم سمجھ
جستنا بھی تو نام سمجھ

اُن معصوموں کا جن کے لہو
یا اُن مظلوموں کا جن سے
کتنے تم نے فروزاں رہیں کہیں
خجھر کی زباں میں باتیں کہیں

اَس مریم کا جس کی عفت
لشتی ہے بھرے بازاروں میں
اَس عیسا کا جو قاتل ہے
اور شائل ہے غم خواروں میں

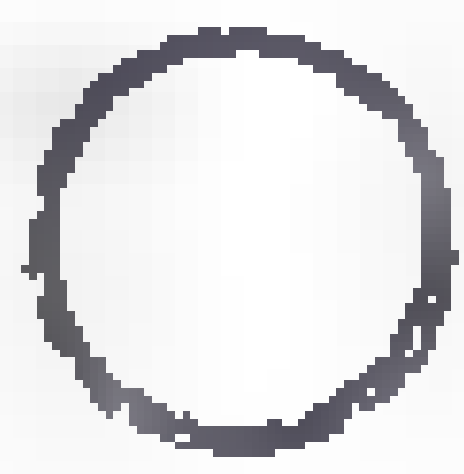
اِن نوحہ گروں کا جن نے ہیں
خود قتل کیا خود روتے ہیں
ایسے جی کہ ہیں دم ساز ہوئے
ایسے جتنا د بھی ہوتے ہیں

اَن بھوکے ننگے ڈھانچوں کا
جو قص سر بازار کریں
یا اَن ظالم قسزاقوں کا
جو عیس بدل کر وار کریں

یا اَن جھوٹے اقراؤں کا
جو آج نلک ایفا نہ ہوئے
یا اَن بے بس لاچاروں کا
جو اور بھی دکھ کا نشانہ ہوئے

اس شابی کا جو دست بدست
آئی ہے تہا ہے حقے میں
سکینوں ننگے وطن کی بات کرو
کیا رکھتا ہے اس قصے میں

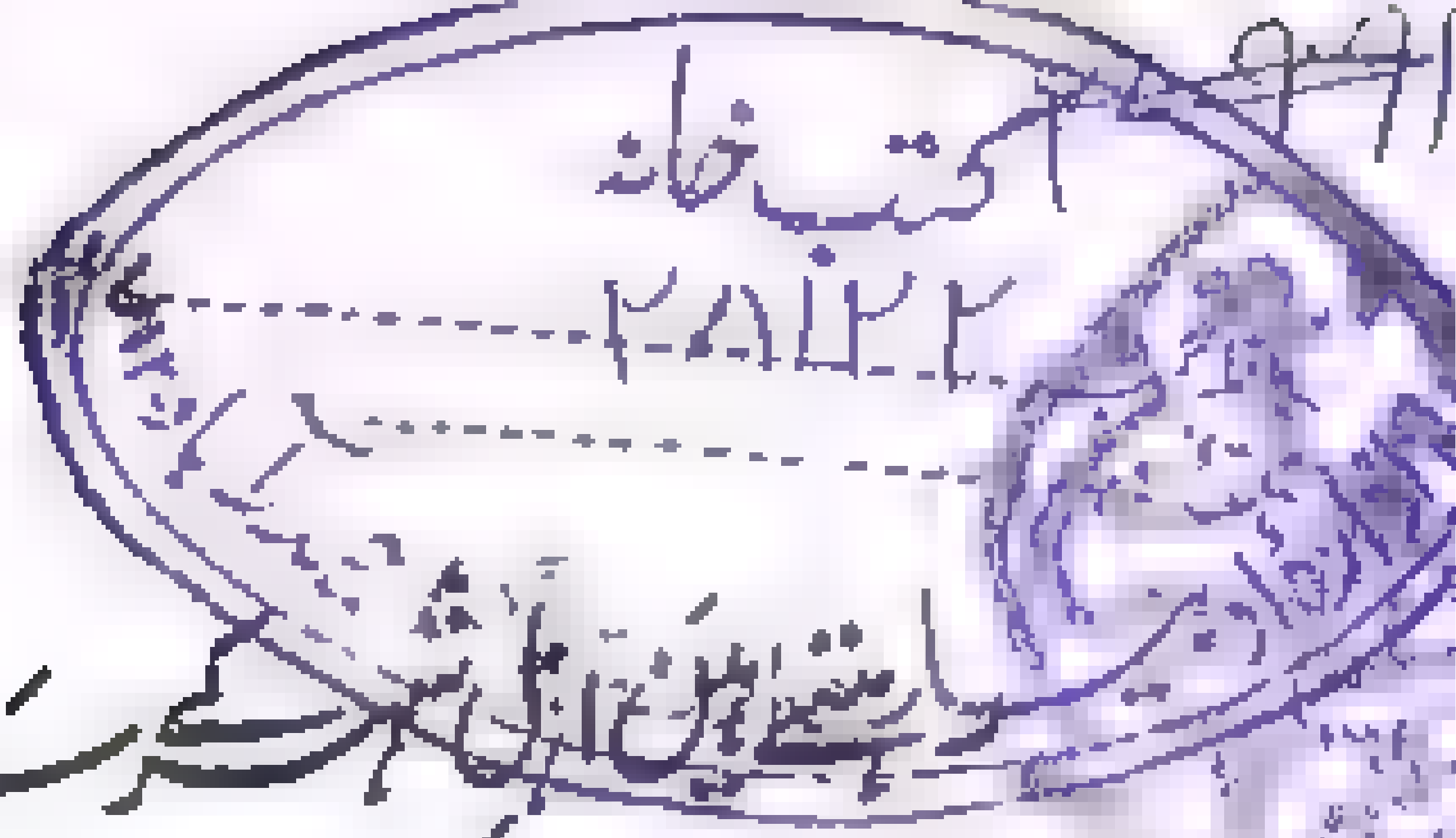
آنکھوں میں چھپائے اشکوں کو ہونٹوں پہ وفس کے بول لئے
اس جشن میں میں بھی شامل ہوں نوحوں سے بھرا کثکول لئے



ابریہیم سارا اب کے کھٹی برس پڑے پڑے
گلشن آجاڑ آجاڑ ہیں جنگل ہرے ہرے

جانے یہ تشنگی ہے ہوس ہے کہ خود کشی
چلتے ہیں شام ہی سے جو ساغر بھرے بھرے

ہے دل کی موت عہد وفا کی شکستگی
پھر بھی جو کوئی ترکِ محبت کرے کرے
اب اپنا دل بھی شہرِ خموشاں سے کم نہیں
سن ہو گئے ہیں کان صدا پر دھڑ دھڑ



ساینتھے ہیں اپنی شہر کے سائے سے دور دور
ہم آہوانِ دشت کی صورت ڈرے ڈرے

گل بن کے پھوٹتا ہے لہو شاخسار سے
زخمِ رگ بہا رہیں پتے ہرے ہرے

زندہ دِلانِ شہر کو کیا ہو گیا فسترا
آنکھیں بھی بکھی ہیں تو بہرے ہوئے

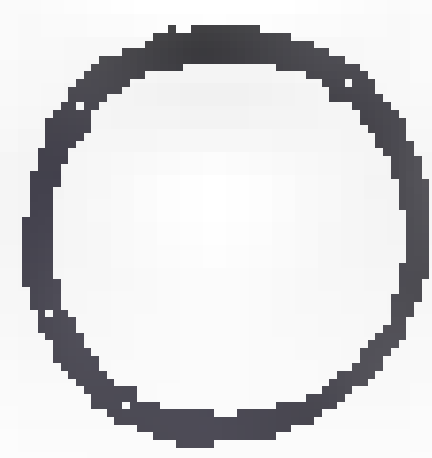
(۶۸۶)

شگفتہ دِل ہیں کہ غم بھی عطا بہار کی ہے
گلِ حبیبِ یائیں سر ہیں ہوا بہار کی ہے

ہجومِ جلوۂ گل پر نقشِ سر نہ رکھ کہ یہاں
جراختوں کے چمن پر ردِ ابہار کی ہے

کوئی تو لالہ خونیں کفن سے بھی بو سچھے
 یہ فصل چاک سبگر کی ہے یا بہار کی ہے
 میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ بھڑپٹائیں
 کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

شمار زخم ابھی ہے فسر از کیا کرنا
 ابھی تو حسان مری ابتدا بہار کی ہے



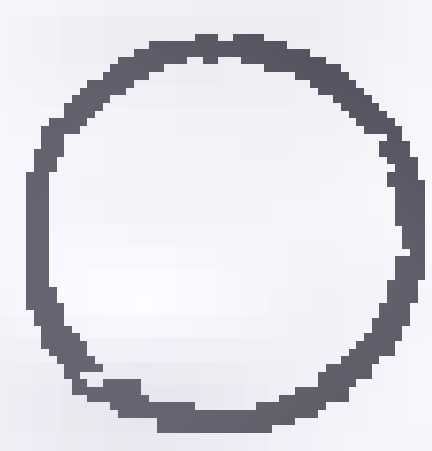
دل گرفتہ ہی کبھی بزم سجالی جائے
 یا وجاناں سے کوئی شام نہ خالی جائے

رفتہ رفتہ یہی زنداں میں بدل جاتے ہیں
 اب کسی شہر کی بنیاد نہ ڈالی جاتے

مصحفِ رخ ہے کسی کا کہ بیباںِ حافظ
ایسے چہرے سے کبھی فساں نکالی جائے

وہ مروت سے ملا ہے تو جھکا دوں گروں
میرے دشمن کا کوئی وار نہ خالی جائے

بے نوا شہر کا سایہ ہے میرے دل پہ فسترا
کس طرح سے مری آشفتنہ خیالی جائے



شتم کا آشنا تھا وہ سچے کے دل دکھ گیا
کہ شامِ غم تو کاٹ لی سحر ہوئی چلا گیا

ہوئے ظلم سو جنتی ہے کس چہنور بنی گئی
وہ اک دیا بجبے تو سینکڑوں دیئے جلا گیا

سکوت میں بھی اس کے اک ادائے دل نواز تھی
وہ یارِ کم سخن کئی حکایتیں سنا گیا

اب ایک ہجوم عاشقاں ہے ہر طرفے واں وداں
وہ ایک نورِ خود کو فتاقلہ بنا گیا

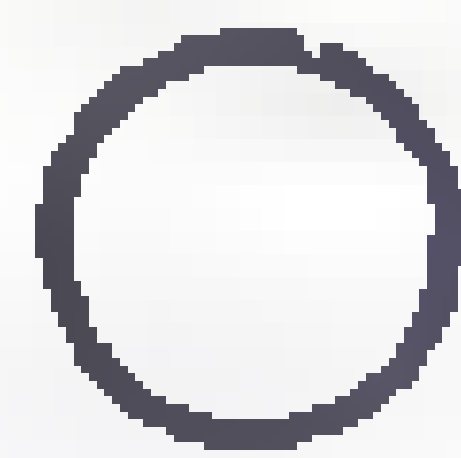
دلوں سے وہ گزر گیا شعاعِ مہر کی طرح
گھٹنے ادا اس جنگلوں میں راستہ بنا گیا

کبھی کبھی تو یوں ہوا ہے اس ریاضِ دہریں
کہ ایک پھول گلستاں کی آبرو دیا گیا

شریکِ بزمِ دل بھی نہیں چراغ بھی ہیں پھول بھی
مگر جو جانِ انجمن تھا وہ کہاں چلا گیا

اٹھو ستم زد و پیلین یہ دکھ کڑا سہ ہی مگر
وہ خوش نصیب ہے یہ زخیم جس کو اس آگیا

یہ آنسوؤں کے ہار خوں بہا نہیں ہیں دوستو
کہ وہ توجہ ان دے کے قرضِ دُستاں چکا گیا



اے مرے یارِ قدحِ ریزہ!

جس اندِ نکلے ہے ہری آنکھ مرے دل میں آتا ہے سب تجھے
آمرے یارِ قدحِ ریزہ مرا جامِ پیکار ہے سب تجھے

جو ہی نہ ہستی میں بیٹھا تھا میرِ شام بھلائے ہوئے ساری دنیا
یہ نہی اک یاد سی جاگ اٹھی تو رگنے لگی پیاری دنیا

میں تو جیسا بکھی ہوں خوش وقت ہوں
 کیسی ہے تمہاری دنیا
 تم نے جس داؤں چیتا ہے
 اسی بازی میں ہاری دنیا
 آمیرے یار قدح ریز

مرا حجام ہے خالی کب سے
 مراد دل چور ہے زخموں سے
 میری آنکھ سوالی کب سے
 پیش منظر میں آب آجاو

کہ ہیں اصنام خیالی کب سے
 منظر مال ہیں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرح
 یوں بجباتے رہیں تالی کب سے
 آمیرے یار قدح ریز

مرا نام ہے گالی کب سے



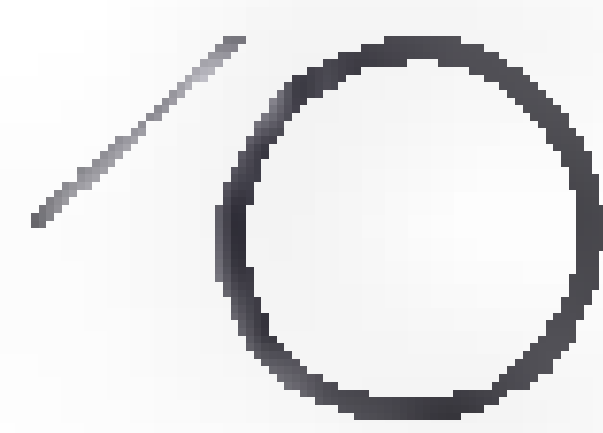
کہا تھا کسی نے کہ عہد وفا کرو اس سے
جو یوں کیا ہے تو پھر کیوں گلہ کرو اس سے

نصیب پھر کوئی تقریبِ شرب ہو کہ نہ ہو
جو دل میں ہوں وہی باتیں کہا کرو اس سے

یہ اہل بزمِ تنگ جو چہل سہی پھر بھی
ذرا فسانہ دلِ اہستہ ادا کرو اس سے

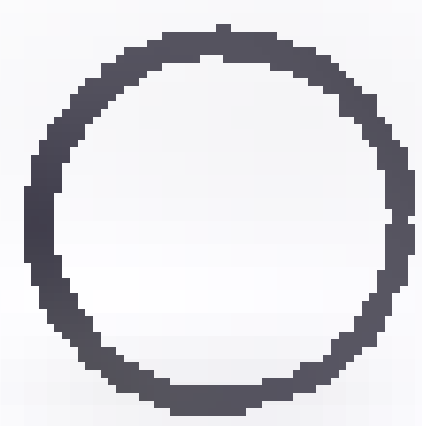
یہ کیا کہ تم ہی غمِ دل کے کفرِ فتنہ کو
کبھی تو اس کے بہانے سے نہ کرو اس سے

سدا از ترکِ تعلق تو خیر کیا ہوگا
یہی بہت ہے کہ کم کم میلا کر داسے



تجھ سے بچپن کے ہم بھی منقذ رکے ہو گئے
پھر جو بھی درِ میلا ہے اسی در کے ہو گئے
پھر یوں ہوا کہ غیبر کو دل سے لگا لیا
اندردہ نفسِ نغہیں کہ باہر کے ہو گئے
کیا لوگ تھے کہ حبان سے بڑھ کر عزیز تھے
اب دل سے چو نام بچی اکشر کے ہو گئے
اے یاد یار تجھ سے کریں کیا شکایتیں
اے دردِ حیران بھی تو پتھر کے ہو گئے
بھیا یہ تھے بچہ کو سبھی ناصحانِ شہر
پھر رفت رفتہ خود اسی کافر کے ہو گئے

اُس کے نہ انتظار کریں چارہ گر کہ ہم
 اُس کے گئے تو کوئے ستم گر کے ہو گئے
 روتے ہو ایک جزیرہ جہاں کو فراز تم
 دیکھو تو کتنے شہر سمندر کے ہو گئے



ہر تماشا شائی فقط ساعل سے منظر دیکھنا
 کون دریا کو آئینا، کون گوہر دیکھنا

وہ تو دنیا کو مری دیوانگی خوش آگئی
 نیسے کراہتھوں میں وگرنہ پہلا پتھر دیکھنا

آنکھ میں آنسو جڑے تھے پر خدا تجھ کو زندگی
 اس توقع پر کہ شاید تو پیٹ کر دیکھنا

میری قسمت کی لکیریں میرے کراہتھوں میں نہ تھیں
تیرے کراہتھے پر کوئی میرا مقدر دیکھتا

زندگی پھیل چلی ہوئی تھی شام ہجراں کی طرح
کس کو اتنا حوصلہ تھا کون جی کر دیکھتا

دُوبنے والا تھا اور سائل پہ چہروں کا ہجوم
پل کی مہلت تھی میں کس کو آنکھ بھر کر دیکھتا

تو بھی دل کو اک لہو کی بوند سمجھا ہے فراز
آنکھ اگر ہوئی تو نقطے میں سمندر دیکھتا



سحر کے سورج

سحر کے سورج

میں رو رہا ہوں

کہ میرا مشرق لہو لہو ہے

وہ میرا مشرق

جو میرا بازو ہے

میرا دل ہے

میر کی نمونہ ہے

جو میرے اطراف کائنات

میر کی آبرو ہے

لہو لہو ہے

سحر کے سورج

میں نہ ہفت تار یک

نصف روشن آوں

کیا ہوا ہے
تجھے کہن لگ گیا

کہ میرا وجود ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے
تیری شعاعوں کا نور اندھیروں میں
گھٹ گیا ہے

کہ آج ہر رشتہ رفاقت ہی کٹ گیا ہے
سحر کے سورج

میں اپنے پسیر کی نصف تصویر ہو گیا ہوں
میں آپ ہی آج اپنی تحقیر ہو گیا ہوں
میں اس تصویر ہو گیا ہوں

میں اپنا آدھا بدن لئے کس طرف کو جاؤں
کسے دکھاؤں

یہ شبِ بے جاں کی کرچیاں
اپنے خواب ریزے کہاں چھپاؤں
میں اپنی وحدت کہاں سے لاؤں

حشر کے سورج
 سستم کی آندھی ر کے
 تو میں یہ اجاڑ آنکھیں جھپک سکوں گا
 لہو کی بارش سے تھمے
 تو میں اس دھکی بدن کو تھپک سکوں گا
 رہی تو میں جانکنی کے دہرے غدا میں ہوں
 جو بچہ جیسے وہ چراغ دیکھوں
 کہ اپنے ماتھے کا داغ دیکھوں
 حشر کے سورج
 مری نظر میں تو آن رفیقوں کے قافلے ہیں
 جو گھر سے نکلے تھے سر اٹھائے
 قدم جمائے
 جو منتظر تھے
 کہ رزم گاہ طلب بلائے
 جو آزمائش کی ہر گھڑی میں

یقین کی مشعلیں جلائے

وطن کی ناموس کے لئے

جسے شہار بازو علم اٹھائے

چپے تھے گھر سے

بہ عہد کر کے

کہ ان کی جانیں رہیں کہ جائیں

مگر و فسا پہ نہ حرف آئے

حسرت کے سورج

مری نظریں انہیں رفیقوں کے قاتلے ہیں

کہ جن کا پسند اریدہ ریزہ

کہ جن کے ماتھے عرق عرق ہیں

جو پایہ زنجیر

منفعل گردنیں جھکائے

دد کے زرعے میں

ان اندھیریوں کی سفر میں کی طرف رواں ہیں

جہاں خفارت کے طعن

نفرت کے سنگ

رسوائیوں کے بازار

منتظر ہیں

وہاں جہاں سو منات کے پتھروں سے

کتنے ہی مہرے محمود غزنوی سنگسار ہونگے
وہاں

جہاں میری ساری تاریخ کے وزق شرمسار ہونگے
حس کے سورج

یہ میں نہ دیکھوں

یہ تو نہ دیکھے

یہ غازیوں کی نظر نہ دیکھے

یہ جانشانوں شہید یاروں کا

ہیچا تا لہو نہ دیکھے

یہ میں نہ دیکھوں

یہ تو نہ دیکھے

وہ تو سب درد کے لمحے تھے

وہ تو ایک خواب پریشاں تھا جو میں نے دیکھا
وہ تو سب درد کے لمحے تھے

جو مجھ پر گزرتے

میرے دیرانِ مہ و سال

مے شام و سحر

میری بخرواحِ محبت۔ مری درماںِ طلبی

سردھسلیں رقیباں

مری درپوزہ گری

آنکھ میں اشکِ ندامت کے

تو چپکے چپکے فشارِ دلِ بجاں

میرا ماضی بھی اندھیرا

مرا فروا بھی دھواں

میں کہیں دھونڈنا
کھوئی ہوئی ہستی کیے نشان

تو یہاں تھانہ وہاں
میں یہاں تھانہ وہاں
وہ تو سب درد کے لمحے تھے

جو مجھ پر گز سے

پھسریہ کیوں ہے
کہ میرا جسم مرا خوں

نہ ہوا خاکستر

کون اس درد کے دوزخ میں
مہ سال تلک جل کے بھی

استادہ رہا

زندہ رہنے پر مہر

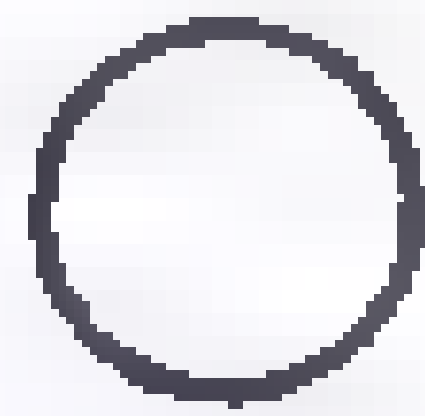
اور نئی زسیت کا ولدادہ رہا

نئی سجدہ سے سر کرنے پہ آمادہ رہا
 بس اسی درد کے دوزخ کا رہا ہوں ایندھن
 اب جو ابھرا ہوں تو اس آگ سے کندن ہو کر
 بین نے اس حسن کو پایا ہے بہت کچھ کھو کر
 اپنے بچے کے ہوئے پندار

کارینہ رینہ

حق رہا ہوں شبِ صحرا سے ستاروں کی طرح
 اپنے ملبوس دریدہ کے پریشاں ٹکڑے
 جنبشِ سوزنِ امید کی خیالی سے
 سی رہا ہوں کہ مرا رسمِ برہنہ نہ رہے
 میرے دیرینہ حریفوں کے لبوں پر کوئی طعنہ نہ رہے
 مجھ پر غرضِ غمِ جان و غمِ دنیا نہ رہے
 وہ تو سب درد کے لمحے تھے
 جو مجھ پر گزرے

اور اب میں نے موسم میں
 کسی شعلہ بے باک کسی پرچیم پیراں کی طرح
 کرہ خاک میں اہرا نے لگا ہوں پھر سے
 لے کے لمحہ آئندہ بے شوق کے فردا
 تری منزل کی طرف آنے لگا ہوں پھر سے
 اپنے خاشاک کو
 انگار سے چمکانے لگا ہوں پھر سے



سوئے فلک نے جانبِ مہتاب دیکھنا
 اس شہر و لنوار کے آداب دیکھنا
 تجھ کو کہاں چھپا ہیں کہ دل پر گرفت ہو
 آنکھوں کو کیا کریں کہ وہی خواب دیکھنا
 وہ موج خوں اٹھی ہے کہ دیوار و در کہاں
 اب کے فیصل شہر کو غرقاب دیکھنا

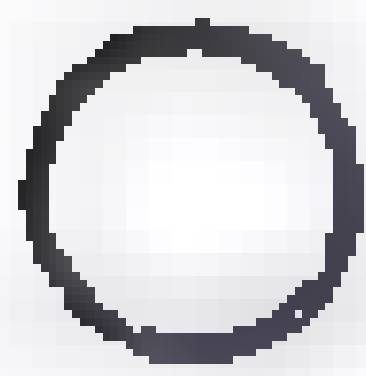
ان صورتوں کو ترسے گی چشمِ جہاں کہ آج
کم یاب ہیں توکلِ ہمیں نایاب دیکھنا

پھر خونِ خلاق و گردنِ مینا بچائیو
پھر حلِ پڑا ہے ذکرِ نئے نایاب دیکھنا

آباد کوئے چاکِ گریباں جو پھر ہوا
دستِ رقیب و دامنِ احباب دیکھنا

ہم لے لو آئے ہیں تجھے اک بیدلی کے ساتھ
اسِ اخبسمن میں لے دل بیتاب دیکھنا

حدِ چاہیے سرازدنا میں بھی اور تہمتیں
غم دیکھتے نہ دل کی تب و تاب دیکھنا



سستم گری کا ہر انداز مجھ پرمانہ لگا
 میں کیا کروں مراد دشمن سے مجھے برانہ لگا
 ہر اک کو زعم تھا کس کس کو نا خدا کہتے
 تھکے لہوا کہ سفینہ کتار سے جہانہ لگا
 میرے سخن کا فشرینہ ڈبو گیا مجھ کو
 کہ جس کو حال سنایا اسے فسانہ لگا
 برون ورنہ کوئی روشنی نہ سہا یہ تھا
 سبھی فساد مجھے اندرونِ خسانہ لگا
 میں تھک گیا تھا بہت پہلے پہلے آڑوں سے
 جی تو دام بھی اس بار آشیانہ لگا
 اس عہدِ ظلم میں میں بھی شریک ہوں جیسے
 مرا سکوت مجھے سمجھتے مجھ پرمانہ لگا
 وہ لاکھ زود فشراموش ہو فشر از مگر
 اسے بھی مجھ کو جھلانے میں اک زمانہ لگا

جو گزرا، سہم کھیلے...

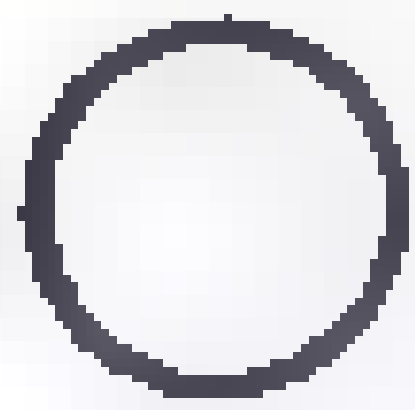
اور ہمیں درو کی منزل پہ پہنچنے والے
 کہہ رہے ہیں کہ اسے اور بھی آسان کرو
 تاکہ ہم اپنے پرانے کو بھی پہچان سکیں
 اور کچھ دوست اسی راہ میں سفرِ بان کرو

شام آئی ہے ہمیشہ یہی لالی لے کر
 جو کبھی خونِ تمتنا کبھی گلزار لگے
 اتنی آشفتنہ نہ تھی خواہشِ یاراں پہلے
 اب تو ہر جذبہٴ آسودہ بھی تلوار لگے

تو کہ تنہا ہے مری طرح تو مجبور نہ بن
 کارواں اُتریں گے اس کو ہنداسے کتنے

شمعیں بجھ جائیں گی اور نور شدید ابھرائیں گے
اور اسی ساحل امید سے پیاسے کتنے

یوں پکاریں گے کہ یہ بوند سمندر کر دے
آج مصلوب جو ہوا اس کو پیسے کر دے
یہ جو ہونا ہے تو ہم یونہی گنہگار رہیں
جو سزا ہم کو ملے اس کے سزاوار ہیں



آزردگانِ شہر کا جیسا بھی حال ہو
اے یارِ خوش دیار تجھے کیوں ملال ہو
اب بات دوستی کی نہیں حوصلے کی ہے
لازم نہیں کہ تو بھی مہم خیاں ہو
اب کے وہ دروڑے کہ ہیں رُودوں تمام عمر
اب کے لگاؤہ زخم کہ حیثا محال ہو

پہلے وہ اضطرابِ بے تحہے کی طرح بھلائیں
اب یہ عذاب کیسے طبیعتِ بحال ہو

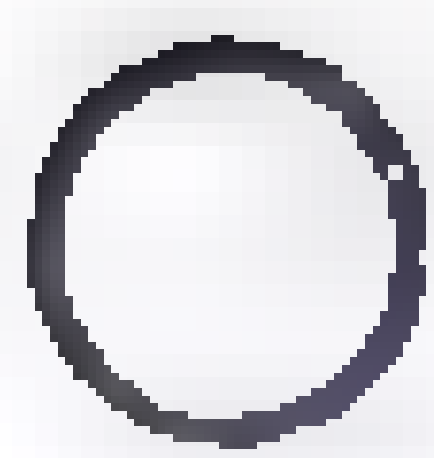
خود میرا ہاتھ جب مری بریادیوں میں تھا
تیری جہٹیں یہ کیوں عرقِ انفصال ہو

پھرتوں نے چھیر دی ہے گئی ساغٹوں کی بات
وہ گفتگو نہ کر کے تجھے بھی ملال ہو

(484)

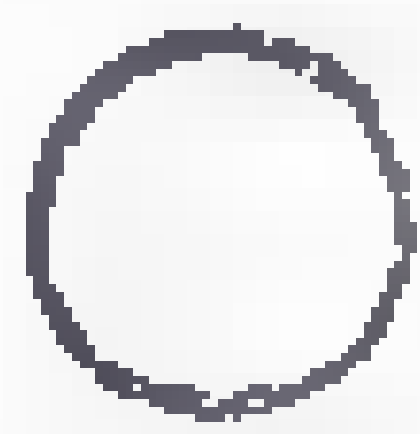
میری ضرورتوں سے زیادہ کرم نہ کر
ایسا سلوک کر کہ میرے حسبِ حال ہو

ٹوٹا تو ہوں مگر ابھی بکھرا نہیں فرار
میرے بدن پہ جیسے شکستوں کا جال ہو



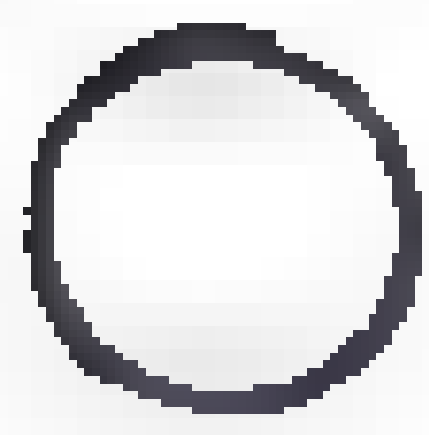
توڑی یادوں کا وہ عالم نہیں ہے
مگر دل کی ادا کسی کلم نہیں ہے
ہمیں بھی یاد ہے مرگِ تھن
مگر اب فرصتِ ماتم نہیں ہے
ہو اے قریبِ منزل کا براہو
سراقِ ہمسفر کا غم نہیں ہے
جنوں پار سائی بھی تو نا صبح
بری دیوانگی سے کلم نہیں ہے
یہ کیا گلشن ہے جس گلشن میں لوگو
بہارِ دل کا کوئی موسم نہیں ہے
قیامت ہے کہ ہر فخرِ خوارِ پیا سا
مگر کوئی حریفِ جم نہیں ہے

صلیبوں پر کھنچے جاتے ہیں لیکن
 کسی کے ہاتھ میں پرچم نہیں ہے
 نہ راز اس قحط زارِ روستا میں
 چتر اغوں کا و سوال بھی کم نہیں ہے



برسوں کے اندر یکساں کس شخص پر دلربا ہے
 اب زمین میں نہیں ہے پہ نامِ خوفِ بھلا سا
 ابرو کچھ کچھ سے آنکھیں جھکی جھکی کسی
 نہیں رکی رکی کسی لبِ تہہ تمکنا تھا کا سا
 الفاظ تھے کہ جگنو آواز کے سفر میں
 بن جائے جنگلوں میں جس طرح راستا سا
 خوابوں میں خواب اس کے یادوں میں یاد کی
 نیندوں میں گھل گیا ہو جیسے کہ رنج کا سا

پہلے بھی لوگ آئے کتنے ہی زندگی میں
 وہ ہر طرح سے لیکن اوروں سے تھا جدا
 اگلی محبتوں نے وہ نام نہادیاں دیں
 تاتہ رتہ فستوں سے دل تھا دراڑا سا
 کچھ یہ کہ مدتوں سے ہم بھی نہیں تھے روئے
 کچھ زہریں بھی تھا احباب کا دلاسا
 پھر لوگوں ہو اکہ ستوں آنکھوں میں بیستھے
 پھر لوگوں ہو اکہ جیسے دل بھی تھا آہلہ سا
 اب سچ کہیں تو یارو ہم کب نہیں تھی
 بن جائے گا قیامت اک واقعہ ذرا سا
 بتورے تھے بے رخی کے انداز دوستی کے
 وہ جس سے تھا لیکن لگتا تھا آشنا سا
 ہم و شمس تھے کہ دیباہ ہم رہے تھے کہ امرت
 ناحق تھا زعم ہم کو جب وہ نہیں تھا پیدا
 ہم نے جس کو دیکھا کل شام آقا ایسا بھی حال ہوا اب لوگوں سے راز کا



جہم شعلہ ہے جی جامہ سادہ پہنا
میسر سورج نے بھی بادل کا لبادہ پہنا

سلوٹیں ہیں میرے چہرے پہ تو حیرت کیوں
زندگی نے مجھے کچھ تم سے زیادہ پہنا

خواتین یوں ہی برہنہ ہوں تو جل بھٹتی ہیں
اپنی چاہت کو کبھی کوئی ارادہ پہنا

یا زخوش ہیں کہ انہیں جامہ احرام سدا
لوگ مانتے ہیں کہ قامت ہے یہ پاؤ پہنا
یار پیماں شکن آئے اگر اب کے تواسے
کوئی زنجیر وفا ہے ثبت وعدہ پہنا

عشیر عشق کو مانع تھی مگر میں نے فرار از
دوست کا طوق سیرِ محفلِ اعدا پہنا



سچ بھی جھوٹا ہے

سچ بھی جھوٹا ہے
کہ اس کے بھی کئی چہرے ہیں
ایک چہرہ کہ تیرے تیرب کی ساعت میں مجھے
نہ کوئی خواہش آغوشِ رسی
اور نہ منائے وصال

ایک چہرہ کہ
ترسے جسم کی حرمت کی قسم کھا کے
ہر اک دیدہ مشکوک کو سمجھا رہا

آسمانوں کے چھپوٹے تارے ہیں

انصاف کو دہرائیں

10

کڑھیں کھانے کے لئے

تو خود سوچتا ہوں

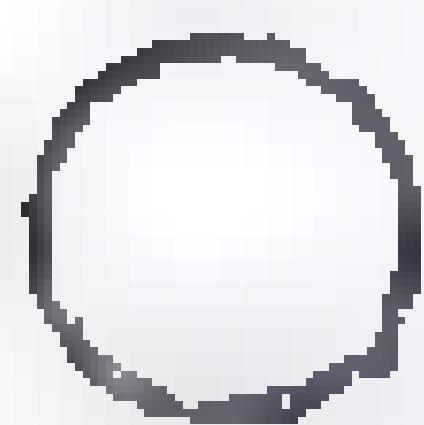
کرامت و ابرار

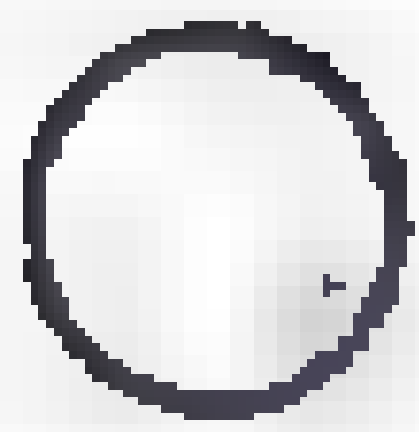
کتابخانه

کیوں نہیں کتاب ہے

—

آپ کے والدین کی کیا حالت ہے





میں نے آغنا ز سے انجام سفر جانا ہے
سب کو دو چار تدم ایل کے ٹھہر جانا ہے

غم وہ صحت سے رقتا کر بگڑے کی طرح
بس کو منسزلی نہ ہی کس کو بھر جانا ہے

یتری نظروں میں سے درد کی قیمت کیا تھی
میسے دامن سے تو آنسو کو گہ جانا ہے

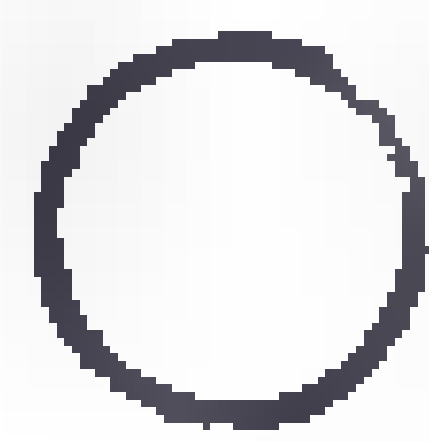
اس کے پھر سے توند پہچان سکیں گے چہرے
میری چاہت کے پندار کو مر جانا ہے

جانے واسے کو نہ رو کہ بھسرم رہ جائے
تخم پیکار و بھی لو کہ اس کو ٹھہر جانا ہے

تیز سورج میں چلے آتے ہیں میری جانب
دوستوں نے مجھے صحرا کا شجر جانا ہے

زندگی کو بھی ترے در سے بھکاری کی طرح
ایک پل کے لئے رکتا ہے گزر جانا ہے

اپنی افسردہ مزاجی کا برا ہو کہ فراز
واقعہ کوئی بھی ہوا آنکھ کر بھڑ جانا ہے



میں کہ پھر دشتِ روقت کا سفر کر آیا
کیا کہوں کتنی اذیت سے گزر کر آیا

ہر کوئی تھم بلا عسیر گریزاں کی طرح
وہ تو جس دل سے بھی گزرا وہیں گھر کر آیا

تم نے ایک سنگ اٹھیا میرے آئینے پر
اور مرخص کو میں اسی سے گر کر آیا

بچہ سے یہ پوچھتے: پرشہر وفا کیسا ہے
یہی لخت سب سے پہلیوں سے اتر کر آیا

مرنے سے پہلے دیکھا اگر کر سب کے آئینے میں
یوں کہ میری دل کا نہر آنکھوں میں جھڑ کر آیا

ایک جہاں جس ٹھہرنے کی نظریہ بہن میں تو لوگو
دور دور پر یہ شہر ت کی نظرسر کر آیا

آہ تو سب سے پہلے جنت کا یہ ٹھہرنے سے شہراز
اور وہ سب سے پہلے بھی تو اپنی ہنر کر آیا



اتنا اٹھائے ہیں مگر لب یہ وعس کوئی نہیں
 نہ مشاوت بھی تو جس کی ریز کوئی نہیں

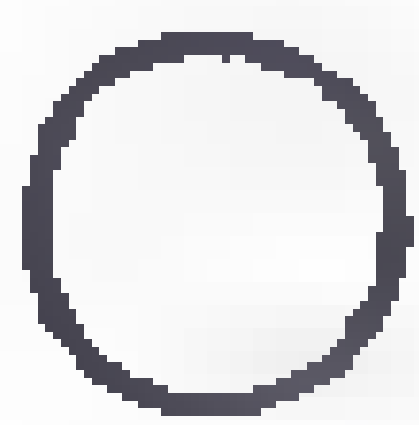
یہ بھی رشتہ آتا تھا، اب تو گوشت پر آواز ہے
 اور پیسہ پر ربط و رابطہ خدا کوئی نہیں

اگر اسب طبع کر رہیں تو نہیں رہیں سب
 کون ماسے گناہم میں پیسہ و ف کوئی نہیں

وہ بے شک و ذوق کس آرائی ہے کہ دل کے شہر
 قلم نرسے ہیں پھر بھی نقش با کبر کی نہیں

خود کو بڑا محصور کر بیٹھا ہوں اپنی ذات میں
 منظر ہیں چاروں طرف شر ہیں راستہ کوئی نہیں

کیسے رستوں سے چلے اور کسی جگہ پہنچے فرار
یا ہجوم دوستان تھا ساتھ یا کوئی نہیں



تو بہتر ہے یہی

یہ تری آنکھوں کی بے زاری یہ ہے کی تھکن
کتے اندیشوں کی حال ہیں یہ دل کی دھڑکن
پیشتر اس کے کہ ہم پھر سے مخالف سمت کو
لے خدا حافظ ہے چل دیں جھکا کر گردن
اُو اس دکھ کو بکاریں جس کی شدت نے ہمیں
اس قدر ایک دوسرے کے غم سے وابستہ کیا
وہ جو تنہائی کا دکھ تھا تلخ محرومی کا دکھ
جس نے ہم کو درد کے رشتے میں پیوستہ کیا

وہ جو اس غم سے زیادہ جاں گسل مائل ہوا
وہ جو اک سیل بلا انگیز تھا اپنے لئے

جس کے پل پل میں تھے صدیوں کے ہمند و حزن
چھپتی یادیں لئے اجر طے ہوئے سینے لئے

میں بھی ناکام وفا تھا تو بھی محسوس مراد
ہم یہ سمجھے تھے کہ درویش ترک رس آگیا

تیری کٹوتی مسکراہٹ قہقہوں میں ڈھل گئی
میرا گم گشتہ سکوں پھرتے مے پاس آگیا

پتتی دو پہروں میں آسودہ ہوئے بازو مرے
تیری زلفیں اس طرح بکھریں گھٹائیں ہو گئیں

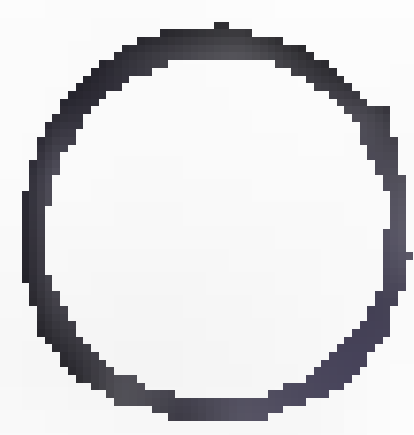
تیرا بدن اپنے سسختہ کو دے انھا
بیرتے نہیں شام کی جھلکی ہوا میں ہو گسٹیں

زندگی کی ساری خوش فحش شہنوں کی طرح
جس طرح سے شام گزرتے جگنوؤں کے شہر میں

جس طرح ہفت سب کی رگی ہیں دوسرے رگوں
جس طرح گھٹکڑی چھٹکڑی شے کی ہر میں

اڑ یہ موہلی تلی ہیں تو بہتر سے یہی
بہتر سے ہم اپنے پرانے زہر کو امرت کہیں

تو اگر چاہتے تو ہم اک دوسرے کو چھوڑ کر
اپنے اپنے بے وفائوں کے لئے روتے رہیں



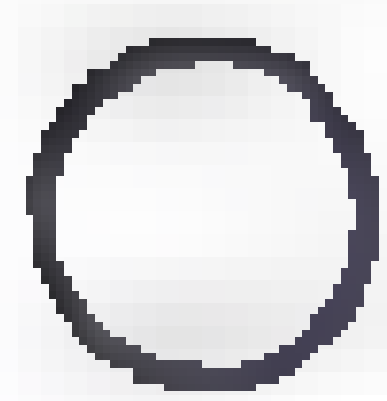
یہ جو نشے ہیں سفر کے نہ اُتر جائیں کہیں
کوئی منزل نہ سہی سامنے پر جائیں کہیں

اس کی محفل نہ سہی ہجر کا عہرا ہی سہی
خواب و خوشبو کی طرح آؤ بکھر جائیں کہیں

مجھ کو یہ دکھ کہ مری چارہ نری کیسے ہو
مجھ کو یہ غم ہے مے زخم نہ ہجر جائیں کہیں

اس خلا میں تو زمیں ٹوٹ کے پاؤں آئے
کوئی قسزم ہو کہ دلدل ہو اُتر جائیں کہیں

گھر سے نکلے تھے کہ دنیا نے پکارا تھا فراز
اب جو فرصت ملے دنیائے تو گھر جائیں کہیں



آنسو نہ روک دامن زخم جگر نہ کھول
 جیسا بھی حال ہو نگہ نہ یار پر نہ کھول
 جب شہر لٹ گیا ہے تو کیا گھر کو دیکھنا
 کل آنکھ نم نہیں تھی تو اب چشم تر نہ کھول
 چاروں طرف ہیں دام شنیدن تپکے ہوئے
 غفلت ہیں طاہران معافی کے پر نہ کھول
 کچھ تو کڑی کھجور مسافت کا دھیان کر
 کوسوں سفر پڑا ہے ابھی سے کمر نہ کھول
 عیسائے بن کہ اس کا مقدر صلیب ہے
 انجیل آگہی کے ورق عسبر بھرنہ کھول
 امکاں میں ہے تو بند و سلاسل پہن کے چل
 یہ جو سلسلہ نہیں ہے تو زنداں کے در نہ کھول
 میری یہی سزا کہ فریاد ہی کروں
 تو چاہتا نہیں ہے تو باب اثر نہ کھول

تو آئیے فروشن و خریدار کور چشم
اس شہر میں فراز دکان ہر نہ کھول



عجب جنون مسافت میں گھر سے نکلا تھا
خبر نہیں ہے کہ سورج کدھر سے نکلا تھا

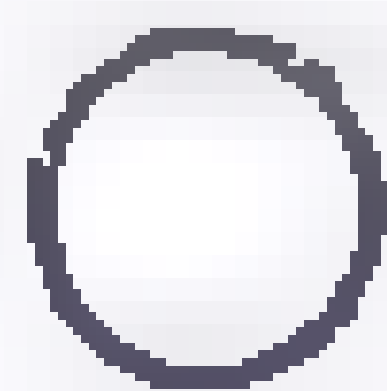
یہ کون پھر سے ابیں راستوں میں چڑ گیا
ابھی ابھی تو عذاب سفر سے نکلا تھا

یہ تیر دل میں مگر بے سبب نہیں اتر
کوئی تو حرف لب چارہ گری سے نکلا تھا
یہ اب جو آگ بن شہر چھپا ہے
ہی دھواں مے در دیوار سے نکلا تھا

میں رات ٹوٹ کے سو یا تو چین سے سو یا
کہ دل کا زہر مری چشمِ تر سے نکلا تھا

یہ اب جو سر میں خمیدہ کلاہ کی خاطر
یہ عجیب بھی تو ہم اہلِ ہنر سے نکلا تھا

✓ وہ قفسِ اب جسے مجنوں پکارتے ہیں فرار
تری طرح کوئی دیوانہ گھر سے نکلا تھا



ترج میرا !

ترج میرا !

میں تیرے قدموں میں

اک سب سے دگر سنگ پیسے کی ضرورت

ترکی جاں ربا رفتوں کی طرف دیکھتا ہوں

ترکی چوٹیاں

برف کے تاج پہنے

ازل سے اسی ممکنیت ستارہ ہیں

سورج کی لالی ہیں ڈوبے ہوئے ابر

ان کا لبادہ ہیں

اور آسمانی جہاؤں کی مانند

مشرق سے مشرب تک

ان کے دامن کشادہ ہیں

اے آسمانی ہواؤں کے مسکن

تری آنکھ نے

روز و شب کے پید و سید

ان گنت قافلوں کا تماشا کیا ہے

ترکی بے حد اگھائیوں سے

کئی فاختوں کے جری شکروں نے گزرتے ہوئے

صاف و شفاف چشموں کا پانی پیا ہے

گزر

وقت کی آبِ بحر کی طرح

تیرے پسلو میں بہتا ہے

اور ان کی تارِ پنج کہتا ہے

جوانبِ عدم کا سفر کر چکے ہیں

جو تیرے مکتبوں کی مانند

زندہ ہیں

پڑھ کر چکے ہیں

میں اُن کی صدا سن رہا ہوں
تو کیا

اپنے مردوں کی پر جھانپیاں
صرف غیظ و غضب جانتی ہیں
تو کیا قہر ہی

ان کی برحق عدالت کا دستور ہے
صرف ادبار کی بجلیاں
ان کا سارا اثاثہ ہیں

اور اپنی درگاہ کے سائلوں میں
ہمیشہ عذابوں کی خیرات ہی بانٹتے ہیں
قیامت ہے

اے اپنے آبا کی رحوں کے مسکن
کہ داوی کے ہر کھیت پر بانجھ پن کی خوشبو ہے
اور مردوزن ڈھور ڈنگر

سجھی بھوک سے ادھ موئے ہوئے ہیں

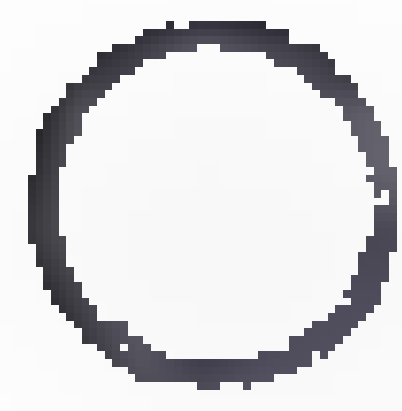
ہمارے یہ بخت بچے فلک کے غاروں میں دیکے ہوئے
 تیرے سورج کی ضو کو ترستے ہیں
 پالے کی شدت سے ہر اک چراگاہ
 مہر کی مانند سوکھی پڑی ہے
 اندھیرے گھنے جنگلوں کے درندوں
 کی خوشنوا آنکھیں ہمیں حرص سے
 دیکھتی ہیں
 تیرے مسہروں اور گھاؤں کی بخشش
 فقط قحط ہے

قبر سوکھے

فیض سوکھے

لے تیرے میر

تو کتنا بے فیض ہے !



طعن زن تھا ہر کوئی ہم پر دلِ ناداں سمیت
ہم نے چھوڑا شہرِ سوائی درجناں سمیت

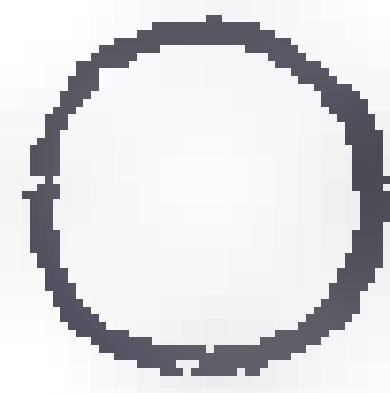
اس قدر اسرہ خاطر کون محفل سے گیا
ہر کسی کی آنکھ پر خم ہے دلِ آزاراں سمیت

اک فقیر شہر کو کیا روش دیکھے جب بھی
میکرے کے دشمنوں میں ہوں قدرِ خواراں سمیت

جشنِ مقتل تھا بپا اور صرف سبیل تھے ہمیں
ہم نے سوچا تھا کہ دیکھیں گے بہ دنِ یاراں سمیت

یہ رعونت تاب کے اے دل نگاراں دیکھنا
اب گرے گاہ طرہ سلطان سر سلطان سمیت

وہ تو کیا آتے شب بھراں تو کیا کشتی فسر از
بچہ گئیں آخر کو شب سمیں چراغ جاں سمیت



ہیں تو لب کھول کے پابند سلاسل ٹھہرا
تیری بات اور ہے تو صاحب محفل ٹھہرا

کیا کہوں کس نے قید مرا تقسیم کیا
آج یوں ہے کوئی بسمل کوئی قاتل ٹھہرا

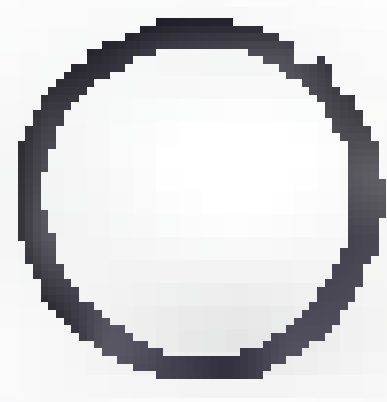
خوابِ آوارہ کسی آنکھ کی تقدیر تو بن
کسی منشِ دل پہ کبھی قافلہٴ دل ٹھہرا

مجھ کو بھی تیری آدا کسی دلِ بیاں سی لگی
ہیں بھی اے شہرِ جدائی تھے قافلِ ٹھہرا

کیا گلہ تجھ سے کہ آشوبِ جہاں ایسا ہے
میں بھی اے یارِ تری یاد سے غافل ٹھہرا

خوشنوا بانِ بزمِ سبب ہیں اسیرانِ قفس
اسکے زنداں بھی تو گلزارِ عفتِ دل ٹھہرا

کتنے ہی سخت مقام آئے مگر جانِ فرار
نہ تراورد ہی ٹھہرا نہ مرا دل ٹھہرا



اس دورے جنوں کی کہانی کوئی لکھو
 جہوں کو برف خون کو پانی کوئی لکھو
 کوئی کہو کہ باق قلم کس طرح ہوئے
 کیوں رک گئی قلم کی روانی کوئی لکھو

کیوں اہل شوق سر بگریاں ہیں دستہ
 کیوں نعل بہ دل ہے عہد جوانی کوئی لکھو

کیوں سرمہ در گڑھے ہر اک طائر سخن
 کیوں گلستاں قفس کا ہے ثانی کوئی لکھو

ہاں تازہ سانحوں کا کسے کون انتظار
 ہاں دل کی واردات پرانی کوئی لکھو

قلم سرخرو ہے

قلم سرخرو ہے
کہ جو اس نے لکھا

وہی آج میں ہوں

وہی آج تو ہے

قلم نے لکھا تھا

کہ جب بھی زبانوں پر پرے

تو باز دسناں تولتے ہیں

کہ جب بھی لبوں پر خموشی کے تلے پڑے ہوں

تو زنداں کے دیوار و در بولتے ہیں

کہ جب حرف نہ بخیر ہوتا ہے

شمشیر ہوتا ہے آخر

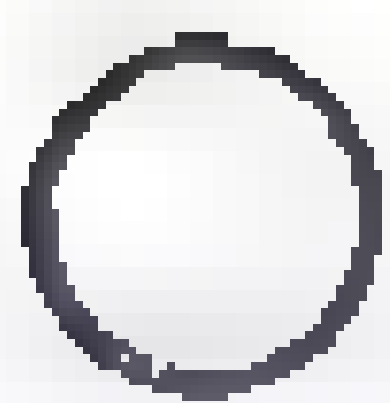
تو اُمّ کی تقدیر ہوتا ہے آخر
 کہ جو عرف ہے زلیبت کی آبرو ہے
 قلم سرخرو ہے
 قلم سبز بکھاتا تھا
 یہ دوسری اسی کی ہے جو
 ظلم کے موسم میں
 کھیلے آسمانوں تلے
 اس کی مٹی میں اپنا لہو کھولتا ہے
 جو اپنے لہو کی نماز سے
 زلفِ غم کی گرہ کھولتا ہے
 وہی جس کی پوروں کے من سے
 سکوت نہیں بولتا ہے
 مگر جس نے برباد کیا کائنات
 اس کے مقدر میں نانِ جوئی تک نہ تھی
 جس کا پیکر مشقت سے پتھر اگیا

اور جس کے لبوں پر نہیں تک نہ تھی
 اسی سے عمارت یہ سب رنگ و بو ہے
 قلم سرخرو ہے
 قلم سرخرو ہے
 کہ اس نے لکھا تھا
 وہ بازو

جو پتھر سے پتھر تراشیں
 مگر بے نشاں آن کے گھر
 بے کفن آن کی لاشیں
 وہی کوہن

جن کے تیشے پہاڑوں کے دل چیر ڈالیں
 مگر خسروان جہاں ان کی شیریں چرا لیں
 وہی جن کے جسموں کے پیوند
 اہل ہوس کی قبا میں نگے تھے
 وہی سادہ دل

جن کی نظریں فلک پر جمی تھیں
 نوبل منعموں کی شنا میں لگے تھے
 اب ان کی شنا چار سو ہے
 قلم سرخرو ہے



آئے تری محفل میں نوبلے تاب بہت تھے
 جواہل وفا واقف آداب بہت تھے

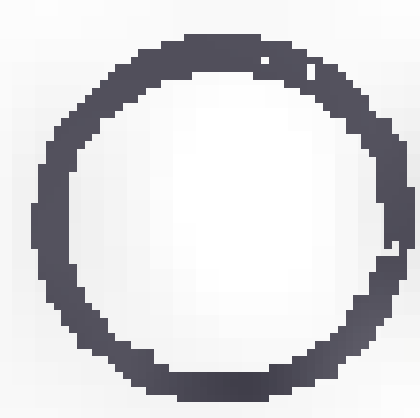
اس شہر محبت میں عجب کال پڑا ہے
 ہم جیسے سبک لوگ بھی نایاب بہت تھے

کچھ دل ہی نہ مانا کہ سبک سر ہوں و گرنہ
 آسودگی حب ال کے تو اسباب بہت تھے

مجسُور تھے لے آئے کنا سے یہ سفینہ
دریا جھلے ہم کو وہ پایاب بہت تھے

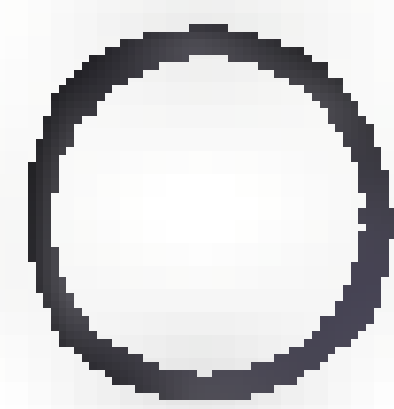
اب دیکھو یہ حشر بھری اجڑی ہوئی آنکھیں
دنیا ترسے بارے میں مرے خواب بہت تھے

ہیں کیوں نہ سرازاں کی طرح ہر بلب تھا
اس بات سے ناخوش مرے اجباب بہت تھے



وفا کے خواب محبت کا آسرا لے جا
اگر چلا ہے تو جو کچھ مجھے دیلا ہے جا

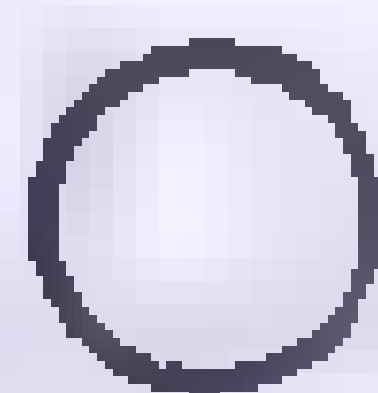
مقامِ سود و زیاں آگیا ہے پھر جاناں
یہ زخم میرے سہی پیر تو اٹھا لے جا

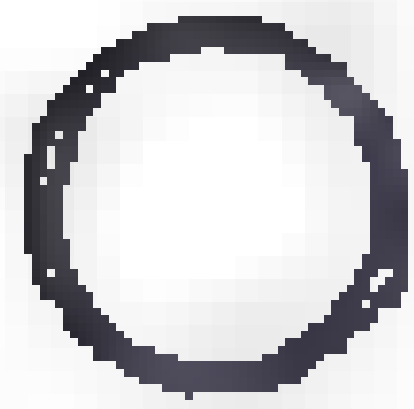


یہی ہے قسمتِ صحرا یہی کرمِ نیرا
کہ بوند بوندِ عطرِ گلِ گشتا لے جا

غُرورِ دوست سے اتنا بھی دل شکستہ نہ ہو
پھر اس کے سامنے دامنِ الحبا لے جا

مستیں ہوں تو سرِ بارِ دوش ہوتا ہے
فسر از جاں کے عوضِ آبر و بچا لے جا





دوست بھی دشمن نہ تھے دل بھی عدو میرا نہ تھا
یہ تو مجھ پر اب کھلا ظالم کہ تو میرا نہ تھا

اس طرح خوش ہو رہا ہوں حشرِ مقتل دیکھ کر
جس طرح ہر نوکِ خنجر پر لہو میرا نہ تھا

اپنے اپنے بے وفاؤں نے ہمیں یکجا کیا
در نہ میں تنہا نہیں تھا اور تو میرا نہ تھا
وہ کہیں بھی چھوڑ جانا کیا گلہ اس سے کہ وہ
اک مسافر تھا شریکِ جستجو میرا نہ تھا
اب تو خود سے بولتے ہیں خوف آتا ہے فراز
ابتدا دلِ آزار طرزِ گفتگو میرا نہ تھا

خٹکٹ ناچ

اک ہاتھ میں رومال ہے اک ہاتھ میں تلوار
پشتون کا کردار

جھوپیا کرے پیار بٹے وار کرے وار کرے
ہر بات پہ تیار

کھسار کے سورج کی طرح گرم و شفق رو
غیبر کی ہواؤں کی طرح تند و تنگ خو
یہ فحشہ دلدار کبھی - شغلہ بیدار
پشتون کا کردار

یہ مرد کہستاں جو چٹانوں میں ڈھلا ہے
شناہیں مہفت آزاد فضاؤں میں بٹلا ہے
رقعتہ درخشندہ و تابندہ و طرار

پشتون کا کردار

یہ رقص و فا کا کئی جنوں کا بھی یہی رقص

جینے کی ادا گردشِ سنوں کا بھی یہی رقص

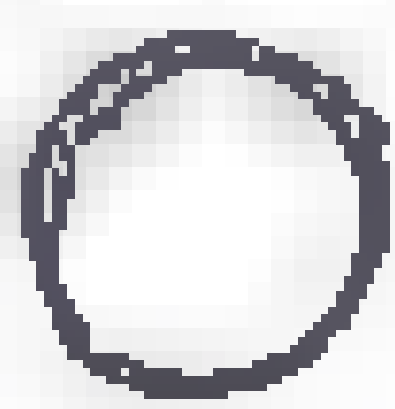
وہ جنگ کا میدان ہو یا امن کا دربار

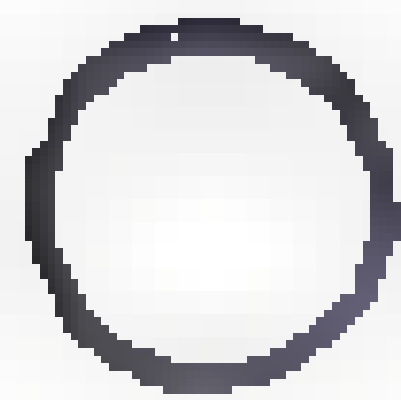
پشتون کا کردار

جو پیار کرے پیار ملے وار کرے وار

ہر بات پہ تیار

پشتون کا کردار





جس سمت بھی دیکھوں نظر اُتے ہے کہ تم ہو
اے جانِ جہاں یہ کوئی تم سا ہے کہ تم ہو

یہ خواہے خوشبو ہے کہ جھونکا ہے کہ پل ہے
یہ دُھست رہے، بادل ہے کہ سایا ہے کہ تم ہو

اس وید کی ساعت ہیں کئی رنگ ہیں لڑال
میں ہوں کہ کوئی اور ہے دُنیا ہے کہ تم ہو

دیکھو یہ کسی اور کی آنکھیں ہیں کہ میری
دیکھوں یہ کسی اور کا چہرہ ہے کہ تم ہو

یہ عسکر گریزاں کہیں ٹھہرے تو یہ جانوں
ہر سانس میں مجھ کو یہی لگتا ہے کہ تم ہو

ہر نرم میں موضوعِ سخنِ دل زدگان کا
اب کون ہے شیریں ہے کہ لیل ہے کہ تم ہو

اک درد کا پھیل ہوا صحرا ہے کہ میں ہوں
اک موج میں آیا ہوا دریا ہے کہ تم ہو

وہ وقت نہ آئے کہ دل زار بھی سوچے
اب شہر میں تنہا کوئی ہم سا ہے کہ تم ہو
آباد ہم آشفتنہ سروں سے نہیں مقتل
پیر ہم ابھی شہر میں زندہ ہے کہ تم ہو
اے جانِ سرا ز اتنی بھی توفیق کہے تھی
ہم کو غم ہستی بھی گوارا ہے کہ تم ہو



نوحہ گروں میں دیدہ تر بھی اسی کا تھا
مجھ پر یہ ظلم بارِ دگر بھی اسی کا تھا

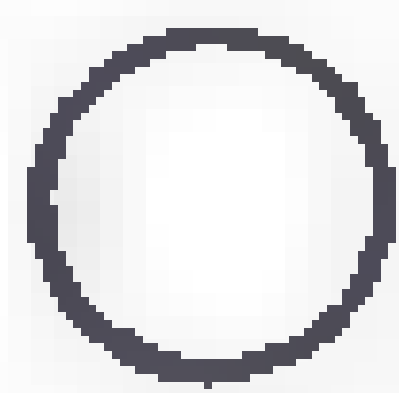
دیکھا مجھے تو ترکِ تعلق کے باوجود
وہ مسکرا دیا یہ مہِ سحر بھی اسی کا تھا

انکھیں کشادہ و لبست سے بدنام ہوئیں
سورج اسی کا خوابِ سحر بھی اسی کا تھا

خبر دراستیں ہی ملا جب کبھی ملا
وہ تیغِ کھینچتا تو یہ سر بھی اسی کا تھا

نِشتر چُھٹے ہوئے تھے رگت جاں کے آس پاس
وہ چارہ گر تھا اور مجھے ڈر بھی اُسی کا تھا

محفل میں کل فسترازی شاید تھا لب کشا
مقتل میں آج کاسہ سر بھی اُسی کا تھا



زُلفِ آنوں کی ہے رنگت ہے، اُجالوں جیسی
پر طبیعت ہے، دُہائی بھولنے والوں جیسی

اک زلمے کی رفاقت پہ بھی رم خور وہ ہے
اُس کم آمیز کی خوبو ہے غزالوں جیسی

ڈھونڈنا پھرتا ہوں لوگوں میں شاہت اس کی
کہ وہ خوابوں میں بھی لگتی ہے خیالوں جیسی

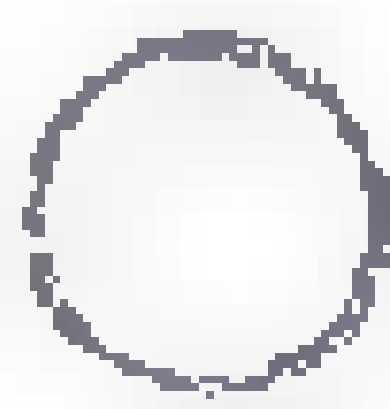
کس دل آزار مسافت سے میں لوٹا ہوں کہ ہے
 آنسوؤں میں بھی تپک پاؤں کے چھالوں جیسی
 اس کی باتیں بھی دل آویز ہیں صورت کی طرح
 بیری سوچیں بھی پریشاں مے بالوں جیسی
 اس کی آنکھوں کو بھی غور سے دیکھا ہے فرات
 رونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی



عید کا رُط

تجھ سے بچپن کر جی زندہ تھا
 مرنے کر یہ زہر پیسا ہے
 چپ رہتا آسان نہیں ہے
 برسوں دل کا خوں کیل ہے

جو کچھ گزری جیسی گزری
 تجھ کو کسب الزام دیا ہے
 اپنے حال پہ خود رو یا ہوں
 خود ہی اپنا چاک سنبھالتے
 کتنی جیسا نکلا بڑے سے میں نے
 تجھ کو دل سے خود سنبھالتے
 سترائے کی جھیل میں تو نے
 پھر کیوں پتھر پتھر کر دیا ہے



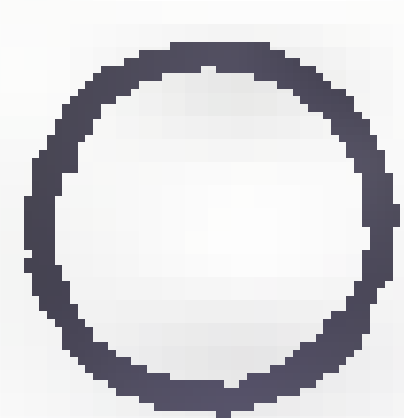
نہ دل سے آد نہ لب سے نصہ نکلتی ہے
 مگر یہ با ست بڑی دور جا نکلتی ہے

ستم تو یہ ہے کہ عہد ستم کے جاتے ہی
 تمام خلق ہری ہم نوا نکلتی ہے

وہ سال ہجرت کی حسرت میں جوئے کم مایہ
کبھی کبھی کسی صحرا میں جا نکلتی ہے

میں کیا کروں میرے قاتل نہ چاہنے پر بھی
تھے لئے میرے دل سے دُعا نکلتی ہے

وہ زندگی ہو کہ دنیا فتراز کیا کیجئے
کہ جس سے عشق کرو بے وفا نکلتی ہے



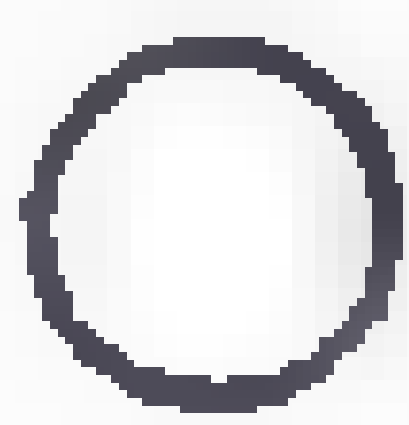
ہٹے تو آنکھ سے آنسو رواں ہمارے ہوئے
کہ ہم یہ دوست بہت مہرباں ہمارے ہوئے

بہت سے زخم ہیں ایسے جوں کے نام کے ہیں
بہت سے قرض ہیں بددستیاں ہمارے ہوئے

کہیں تو آگ لگی ہے وجود کے اندر
کوئی نور دکھ ہے کہ چہرے کے درمیان ہمارے

گر جبرس کے نہ ہم کو ڈبو سکے بادل
وہ یہ ہوا کہ وہی بادیاں ہمارے ہوتے

فراز منزل مقصود بھی نہ فقی منزل
کہ ہم کو چھوڑ کے ساقی رواں ہمارے ہوتے



فراز آب کوئی سودا کوئی جنون بھی نہیں
مگر قرار سے دن کٹ رہے ہوں یوں بھی نہیں

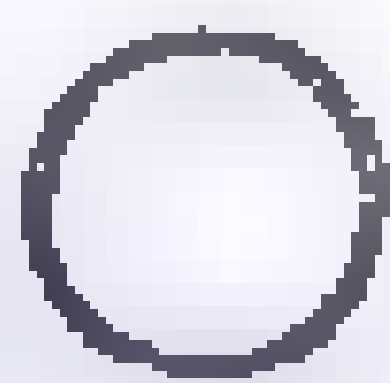
لب و ہن بھی بلا گفتگو کا فن بھی ملا !
مگر جو دل پہ گزرتی ہے کہہ سکوں بھی نہیں

نہ جس نے کیوں مری آنکھیں برسے لگتی ہیں
جو سچ کہوں تو کچھ ایسا اداس ہوں بھی نہیں

مری زباں کی لکڑت سے بدگمان نہ ہو
جو تو کہے تو بچے عمر کتنی ملے بھی نہیں

دکھوں کے ڈھیر لگے ہیں کہ لوگ بیٹھے ہیں
اسی دیار کا ہیں بھی ہوں اور ہوں جی نہیں

فراز جیسے زیا قمر بستر ہوا چاہے
وہ پاس آئے تو ممکن ہے ہیں ہوں بھی نہیں



میوڑ کا

(سپین کا پکٹ خوبصورت تاجیز)

میوڑ کا کے ست حلوں پہ کس قدر گامی تھے
کہ خوشبریں تھی بے طرح کہ رنگوں میں تھے

شکستہ بیاں شتاروں کی تھیں قیاسیہ
تمام سیم تو تھیں یکساں شہر تھے

شعاعِ مہر کی فہم سے تھے ہرگز بدلتے
قصرِ جاں جن کے عکس روشنی کے ہاتھ تھے

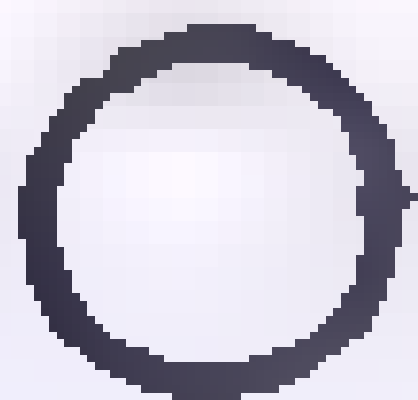
کھلی فضا کی دھوپ وہ کہ جسم سا نوے کرے
یشانِ آوری کہ مست غفلتِ آفتاب تھے

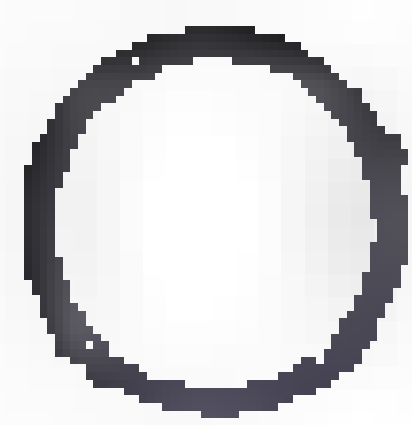
یہ ہیں پتہ چلا کہ زینتِ حسن ہے بہار ہے
یہ ہیں خبر ہوئی کہ زندگی کے دکھ سہرا ہے تھے

یہ ہیں لگا کہ گردِ نشوں کے زاویے بدل گئے
نہ روز و شب کی تلخیاں نہ وقت کے غدا ہے تھے

مے تمام دوست اجنبی رفاقتوں میں گم
میری نظر میں تیرے خدو خال تیرے خواب تھے

میں دُورلوں کے باوجود تیرے کراں پاس تھا
میورکا کے ساحلوں پہ میں بہت اداں تھا





تھی مکے خنام ہیں دروئے تنہائی بہت
کل کسی یار قدح ریز کی یاد آئی بہت

نہ کوئی موسِ دل تھا نہ کوئی دشمنِ جاں
پہلے پہلے تو طبیعت مری گہرائی بہت

کبٹیس کی قبر پہ پہنچا تو بھرا آئی آنکھیں
اُس جواں مرگ سے جیسے تھی شناسائی بہت

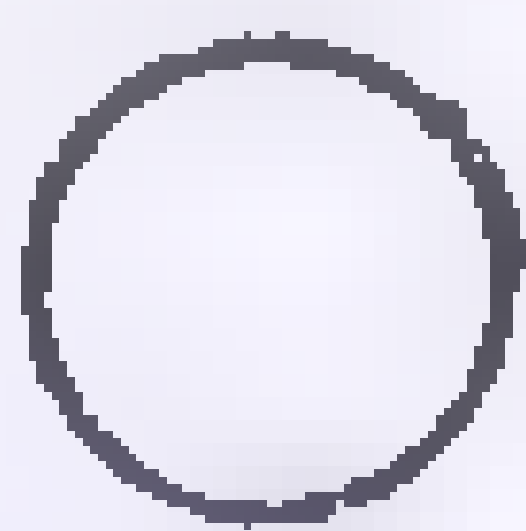
نشہ اترتا تو بدن یوں تھا شکستہ جیسے
بادہ پیمائی تھی کم باد پہ پیمائی بہت

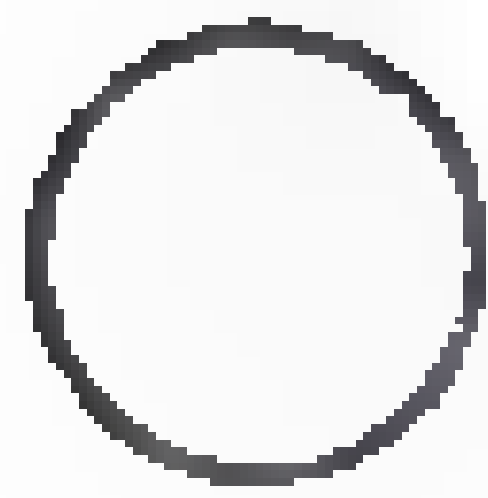
اب تو رشک آتا ہے یاروں کی جو ہر گز پر
زندگی میں بھی کبھی تھا تیرا شیرازی بہت

روم کا حسن بہت دامن دل کھینچتا ہے
اے مری خاک پشاور تری یاد آئی بہت

اول عشق کی بات اور تھی جو بھی ہوتا !
اب تو سیچے کہ نہ ملتے ہیں ہے سوائی بہت

اب ہنسنا اپنے میں سے بھی ابید نہ رکھ
نہ رشک دل بہت تیرے خم میں گہرائی بہت

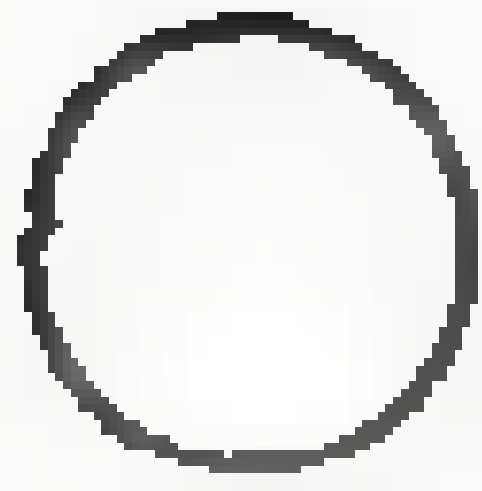




جو سرتبوں کے نشے تھے وہ اب آتے نہ گئے
ہوا جلی بیسے تو جھوٹے اُداس کر سنے لگے

گئی راتوں کا تعلق بھی جہاں پر اکتفا
بہت سے بچوں نے ہوشموں میں نہ لگے

وَد مدتوں کی جدائی کے بعد آتے سے ملا
تو اس طرح سے کہ اب ہم گریز کرنے لگے
غزل ہیں جیسے ترے خدو حال بول اٹھیں
کہ جس طرح تری تصویر بات کرنے لگے
بہت دنوں سے وہ گھمیر خاشی ہے فرار
کہ لوگ اپنے خپالوں سے آپ ڈرنے لگے



انہیں خوش گمانیوں میں کہیں جاں سے بھی نہ جاؤ
وہ جو چارہ گر نہیں ہے اسے زخم کیوں دکھاؤ

یہ اداسیوں کے موسم کو نہی رائیگاں نہ جائیں
کسی یاد کو پکارو کسی درد کو جگاؤ

وہ کہانیاں اُدھوری جو نہ ہو سکیں گی پوری
انہیں میں بھی کیوں سناؤں انہیں تم بھی کیوں سناؤ
یہ جُدائیوں کے رستے بڑی دُور تک گئے ہیں
جو گیا وہ پھر نہ آیا مری با ست ماں جاؤ
کسی بے وفا کی خاطر یہ جنوں فرار کب تک
جو تمہیں بھلا چکا ہے اُسے تم بھی بھول جاؤ

(414)

طعتہ زن کیوں ہے مری بے سروسامانی پر
 اک نظر ڈال ذرا شہر کی ویرانی پر
 واعظوں میں سے بھی انصاف کی بشارت کی ہے
 پر کوئی نقش نہیں ہے مری پیشانی پر
 ان کے بلبوس میں پیوند رکھے جسم کے ہیں
 اور پاروں کی نظر سے مری ترانی پر
 وقت زکنا ہی نہیں خواب ٹھہرتے ہی نہیں
 پاؤں جھٹے ہی نہیں بہتے ہوئے پانی پر
 کشتی جاں بے کہ دروے چلی جانی غفرار
 اور بھی درد کا دریا نہیں طغیبانی پر

اَلِ تاشقند کے نام

(ایک مجسمہ دیکھ کر)

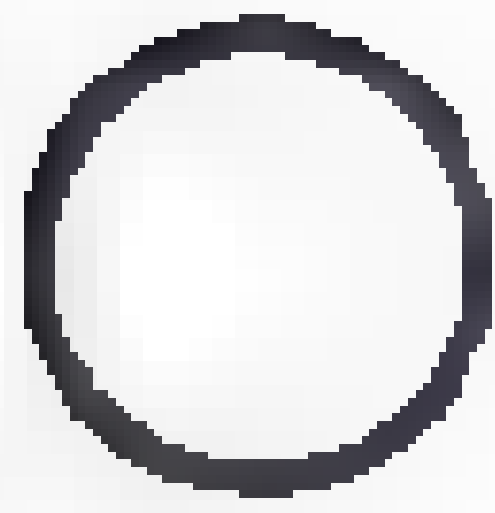
کانسی کے مجسمے میں کیا کیا
 اظہار ہے، کرب ہے، نمونہ ہے
 انسان کے عزم کی علامت
 قسرت کے ستم کے روبرو ہے

ہاتھوں میں غضب کا حوصلہ ہے
 ہاتھوں پہ جبرِ الٰہی آبرو ہے
 آنکھوں میں وقارِ فائز ہے
 چہرہ روں پہ گلاب سا ہوا ہے

ہر بار بلا کارن پڑا تھا !

ہر بار حیاتِ سرخرو ہے

جیسے کہ مجسمے ہیں یہاں جیسے کہ مجسمے ہیں تو ہے



خود آپ اپنی نظر میں حقیر ہیں بھی نہ تھا
اس اعتبار سے اس کا اسیر ہیں بھی نہ تھا

بنا بنا کے بہت اس نے جی سے باتیں کیں
میں جانتا تھا مگر حرف گیر ہیں بھی نہ تھا

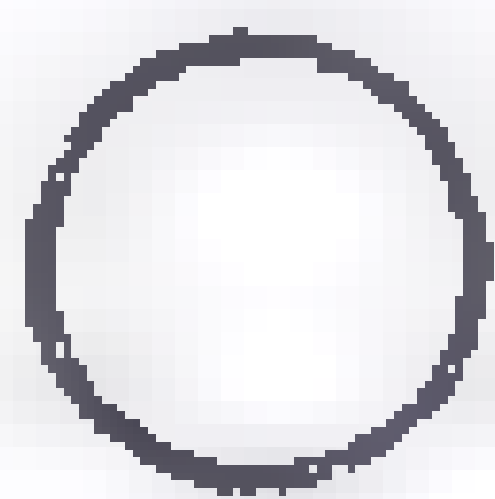
بجھ رہا ہے یہی وصفِ دوستی شاید
وہ بے مثال نہ تھا بے تفسیر ہیں بھی نہ تھا

سفر طویل سہی گفتگو مزے کی رہی
وہ خوش مزاج اگر تھا تو میر نہیں بھی نہ تھا

۴۴۱
ہیں برگِ آخرِ شہر خزاں تھا خاک ہوا
کھنکھاتا کہ موسمِ گل کا سیر میں بھی نہ تھا

ہیں کہیں ۔۔۔ تھا رفیقوں سے جی کڑا رکھو
چلا جو درد کا اکس اور تیر میں بھی نہ تھا

ستم کے عہد میں چپ چاپ جی تباہوں فرار
سو دیسروں کی طرح باغیہاں میں بھی نہ تھا



یوں تو محسوس ہوا کہ مجھے دہن میں میرا تھا
پھر بھی جرحِ چاہوا جس کا وہ سخن میرا تھا

میں نے کس نشہِ نخوت میں کہاں پہنچی تھی
پھر جس جسم میں اُترا وہ بدن میرا تھا

تو کبھی غور سے دیکھو اپنی قبائے رشیم
تیسیرے ملک میں کوئی تار کفن ہی سرا تھا

اب ترچہ کو بھی ند است سہجے و نابہ راہی
مختلف گستاخانے سے چلتے ہیں اٹھ

آنسو کی شام خزاں ٹوٹ کے پانی میں
پھر نشین ہی مانتا نہ چمن ہی سرا تھا

میری آنکھوں نے جو دیکھا میرے لب پر آیا
میری تفصیری بے ساختہ پن میرا تھا

تھی آفتابہ آفتابوں تو میری خاک فراز
کس قدر تنگ مگر مجھ پر وطن میرا تھا



ہوا کے زور سے پندار بام و در بھی گیب
جہراغ کو جو بچانے تھے آن کا گھر بھی گیب

پکارتے رہے محفوظ کشتیوں والے
میں ڈوبتا ہوا دریا کے پار اتر بھی گیا

اب احتیاط کی دیوار کیا اٹھاتے ہو
جو چور دل میں چھپا تھا وہ کام کر بھی گیا

میں چپ رہا کہ اسی میں تھی عاقبت جاں کی
کوئی تو میری طرح تھا جو دار پر بھی گیا

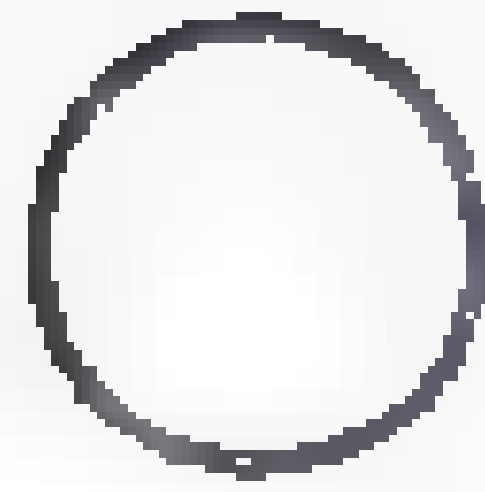
سُکھتے سوچتے دیرانِ موسموں کی طرح
کڑا تھا عیشِ جوانی مگر گزر بھی گیا

جیسے کھیلنا نہ سکا اس کو یاد کیا رکھتا
جو نام لب پہ رہا زہن سے اتر بھی گیا

بھٹی بھٹی ہوئی آنکھوں سے یوں نہ دیکھ مجھے
تجھے تلاش ہے جس شخص کی وہ مر بھی گیا

مگر فلک کو عداوت اسی کے گھر سے تھی
جہاں فرار نہ تھا سبیل غم اِدھر بھی گیا





ہر دوا درد کو بڑھا ہی دے
اب تو اسے دل سے بھلا ہی دے

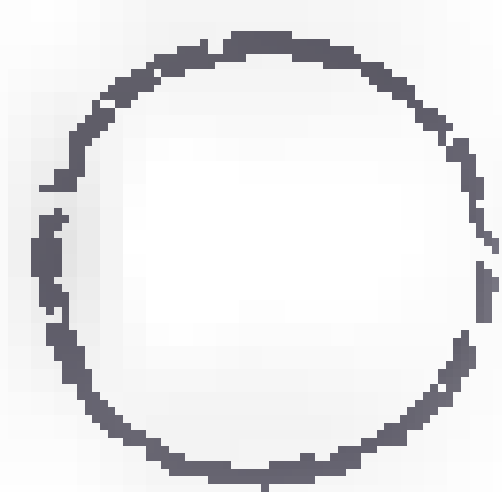
ٹٹنے والے سے یوں گریز نہ کر
کیا خیر وہ تجھے دعا ہی دے

جس کے چہرے پر میری آنکھیں ہیں
وہ مجھے طعن کم لگا ہی دے

یہ بھی اکے شیوہ رفاقت ہے
جس نے والوں کو راستا ہی دے

جانکی کے عذاب سے نیکلوں
آخری تیر بھی چپڑائی سے

اب تو جیسے فسرانِ بادِ مراد
زندگی کا ریا بکھڑا رہے



کہا نہیں تھا

کہا تھا
اس شہر کو نہ جاؤ
اب اپنی آنکھوں سے دیکھتے
تو رہے ہو
کہ اب وہاں تم نہیں

نئے لوگ بس گئے ہیں

کہا تھا

اب شہر آرزو

دشت جبال رہا ہے

گئے زمانوں کی خوشبودیں کب سے مر چکی ہیں

جدا یہاں کام کر چکی ہیں

تمہارے نغموں کے ترم پورے

نئی رتوں کی شدید لوسے جھاس گئے ہیں

گلاب کے سرخ سرخ بھولوں کو

کاسنی سانپ ڈس گئے ہیں

وہ گھٹگوڑوں کی آنکھیں

سکوت کیے ریزار میں دفن ہو گئی ہیں

وہ عہد و پیمیاں کی فاختائیں

آفاق کے اس پار کھو گئی ہیں

کہا تھا

وہ ساعین نہ لوں گی
جو گئی ہیں

کہا تھا
تم قرب کے نشے میں
انام کے مہینہ چن رہے ہو

کہا تھا
تم اس وفا کے صحرا میں
اپنی آواز کس سن رہے ہو
ڈراؤ نے خواب بن رہے ہیں
تمہیں بڑا زعم تھا

کہ آنکھوں کے آئینوں کو
ہر انجن کو سجا رہے تھے
تمہیں غرور اپنی ذات پر تھا
کہ اپنا سب کچھ لٹا رہے تھے
کہا تھا

ان آئینوں کو اب دیکھنے نہ جاؤ
کہ ان میں اوروں کے عکس ہوں گے
کہا تھا

ان رستوں پہ اب تم نہ گنگناؤ
کہ دوسرے چور قصے ہوں گے
یہ آئینے

جو ہر ایک دیوار پر سجے ہیں
تمہارے شکوں کی کا پٹخ ہے بس
یہ برف کے پیکروں کے شعلے
تمہارے سانسوں کی آ پٹخ ہے بس
فراق کی بات ہی جدا ہے
یہاں تو آنکھوں سے آئینوں سے
جو عکس اور جھل ہوا
تو پھر وہ کہیں نہیں تھا

پلٹ کے آئے تو کیا

نہ آئے تو کیا

کہ آنکھیں لڑا بیٹے ہیں

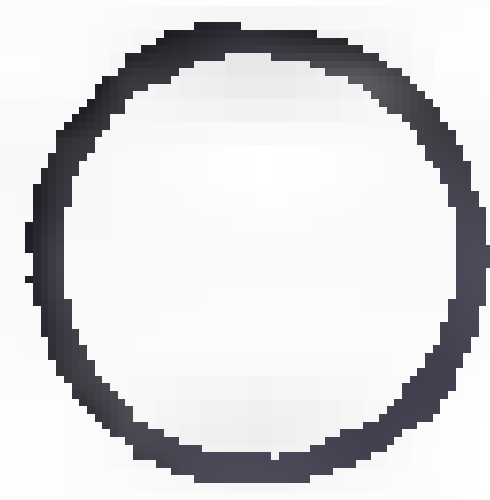
اویس بیٹوں کو غرض نہیں ہے

کہ کون پھرہ نظر نشین تھا

وہ گورڈا پتھر تھا یا نگین تھا

کہا نہیں تھا





قامت کو تیرے سرودِ سنوبر نہیں کہا
جیسا بھلی تو تھا اس سے تو بڑھ کر نہیں کہا

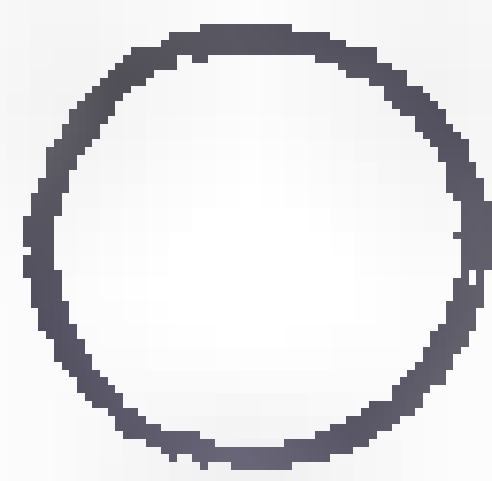
اس سے ملے تو زعمِ نکلم کے باوجود
جو سوچ کر گئے وہی اکشر نہیں کہا

اتنی مروتیں تو کہاں دشمنوں میں تھیں
یاروں نے جو کہا کے صنفِ پیر نہیں کہا

مجھ سا گتہ نگار سرِ دار کہہ گیا
واعظ نے جو سخن سرِ منبر نہیں کہا

ہم ہیں اس خطایہ امیرانِ شہر ہیں
ان جو ہڑوں کو میں نے سب در نہیں کہا

یہ لوگ میسری فردِ عمل دیکھتے ہیں کیوں
میں نے فسادِ خود کو پسیدہ نہیں کہا



انتسابے رنگ لکھ کو نہیں جانیے ہر گناہِ شمعِ بدن ہوئے گی
لوگ پھر سے اچھا ہیں گے اپنا لہو اور گلگوں تباہے وطن ہوئے گی

تاجکے یونہی اختر شمار کی کرو جوئے خوں پنی رنگ سے جاری
اور پچھو روزِ سینہ فکاری کرو بزمِ خاموش بزمِ سخن ہوئے گی

تمہ نے ہونٹوں پہ ہریں لگا دیں تو کیا تم نے شمعیں نوا کی بھادیں تو کیا
جو حکایتِ سنی ان سنی ہو گئی اب ہی انجمنِ اخبہ من ہوئے گی

اب نشانی سیجا عجبست و دروایت قائل ہے بس جنتجو اس کی ہو
 ورنہ تمام خدان سزا ہوئے گا اور خستہ خدا ہے کفن ہوئے گی

رست کو آخر بدلتا تو ہے دروایت اس قیامت کو ملنا ہے دروایت
 اس طرف ہم کو چن تو ہے دروایت حشر طرف فعل وار و سن ہوئے گی



میں ترا قائل ہوں

ہیں ترا قائل ہوں

اے مشرق مجھے مصلوب کر

ہیں جو عیسا کے لبادے

ہیں ترے بیمار فرزندوں کے گھر

آیا تھا

کل چارہ گری کے واسطے

میں نے ان سے کیا کیا
 میں کہ دریاں بن کے آیا تھا
 ترے ناسور زخموں کے لئے
 بارود کا مرہم لئے
 بندوق کا پرچم لئے
 مسیکر بوجھل بوٹ
 جن کی چاب

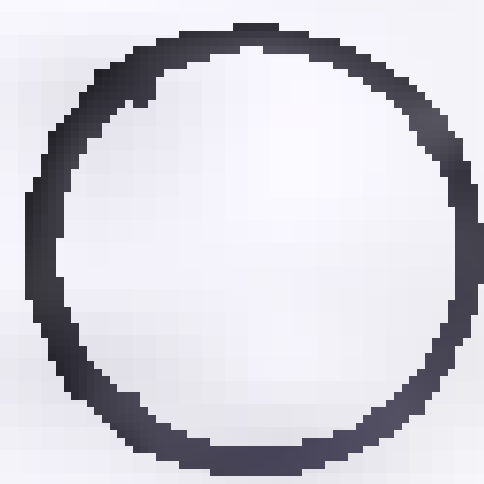
تیرے چہرہ بداروں سی تھی
 اب کی بار ایسے زلزلے لائے
 کہ تیرے ہنستے بستے شہر بے بن گئے
 (اور درو دیوار کے ڈھیر دیں ہیں
 گر لاتا ہوا

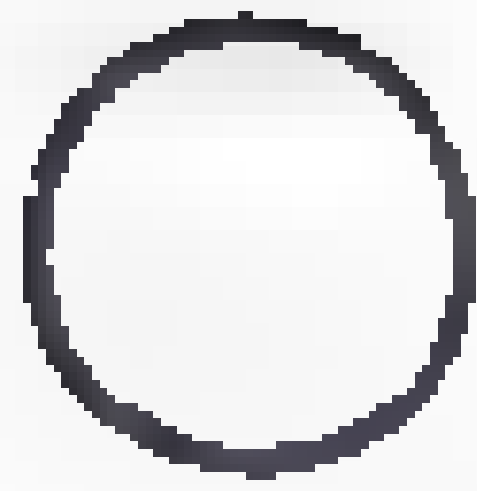
گونگے بکینوں کا لہوا
 خاکِ خوں کے اس گلابے سے
 ہیں اپنے بھارتی بوٹوں کو نکالوں کس طرح

یہ مری بندوق میرے دوش پر اک بوجھ ہے
اور ز میں مجھ کو نگلتی جا رہی ہے دم بدم

میرے مشرق
جانکشی کے اس مسلسل کرب سے
مجھ کو بچا ہیے کر لہو میں ڈوب کر
میں تیرا قاتل

نرا عیسا
مجھے مصلوب کر





جو سر بھی کشیدہ ہو اُسے دار کرے ہے
اغیار تو کرتے تھے سواب پار کرے ہے

وہ کون ستمگر تھے کہ یاد آنے لگے ہیں
تو کیا مسیحا ہے کہ بیمار کرے ہے

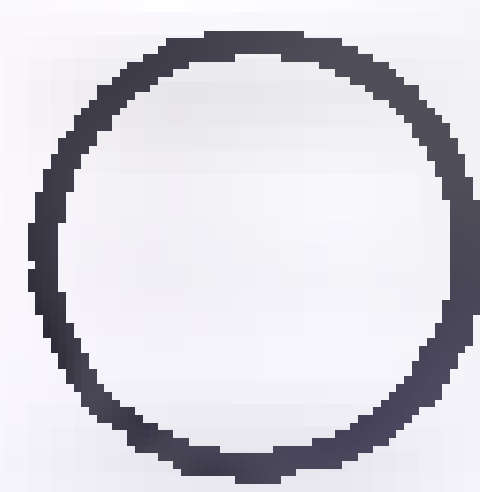
اب روشنی ہوتی ہے کہ گھر جلتا ہے دیکھیں
شعلہ سا طوافِ درو دیوار کو سے ہے

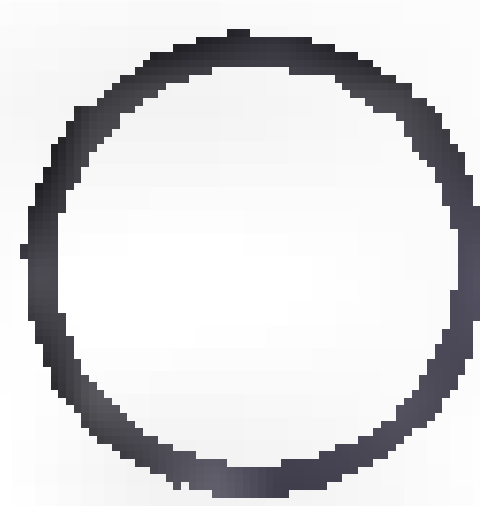
کیا دل کا بھروسہ ہے یہ بھلے کہ نہ سنیں
کیوں خود کو پریشاں مرا غمخوار کرے ہے

ہے ترکِ تعلق ہی مدد اس کے غمِ جاں
پھر ترکِ تعلق تو بہت خوار کرے ہے

اس شہر میں ہو جنبشِ لب کا کیسے یارا
یاں جنبشِ مژگاں بھی گنہگار کرے ہے

تو لاکھ سرازِ اپنی شکستوں کو چھپائے
یہ چپ تو ترے کرب کا اظہار کرے ہے





کشیدہ سر سے توقع عبث جھکاؤ کی تھی
بگڑ گیا ہوں کہ صورت یہی بناؤ کی تھی

وہ جس گھمنڈ سے بچھڑا گلہ تو اس کا ہے
کہ ساری بات محبت میں رکھ رکھاؤ کی تھی

وہ مجھ سے پیار نہ کرتا تو وار کب کرتا
کہ دشمنی میں بھی شدت اسی لگاؤ کی تھی

مگر یہ دردِ طلب بھی سراب ہی نکلا
دُعا کی لہر بھی جذبات کے بہاؤ کی تھی

اکیسے پار اتر کر یہ خدا نے کہا
مسافر وہی قسمت شکستہ ناؤ کی تھی

چراغِ جاں کو کہاں تک بچا کے ہم رکھتے
ہو ابھی تیز تھی، منزل بھی چل چلاؤ کی تھی

میں زندگی سے نبردِ آزارِ ماہوں فرار
میں جانتا تھا یہی راہ اک بچاؤ کی تھی

ہر کوئی جاتی ہوئی رُت کا اشارہ جلنے
”گل نہ جانے بھی تو کیا باغ تو سارا جانے“

کس کو بتلائیں کہ آشوبِ محبت کیا ہے
جس پہ گزری ہو وہی حال ہمارا جانے

جان نکلی کسی سہل کی نہ سُورج نکلا
 بچہ گیا کیوں شبِ ہجر ال کا سنا جانے

جو بھی ملت ہے ہمیں سے وہ گھر کرتا ہے
 کوئی تو صورتِ حالات خدا را جانے

دوست احباب تو رہ رہ کے گلے ملتے ہیں
 کس نے خنجر مرے سینے میں اتارا جانے

تجھ سے بڑھ کر کوئی ناداں نہیں ہوگا کہ فرار
 دشمن جاں کو بھی تو جان سے پیارا جانے

میں کیسا کھڑا ہوں

پیمبر!

تری ہار گاہِ محفل میں
عمیال کے انبار سے سزگوں
اک گنہگارِ انساں کھڑا ہے

نہ اس کے بدن پر عبا و قبا ہے
نہ ہاتھوں میں تسبیح کا سلسلہ ہے
نہ ماتھے پہ مخرابِ داغِ ریا ہے
یہ وہ بد مقتدر ہے
جس کا بدن بدشِ سنگِ خلقت سے
غریب ہے

جس کی گردن میں طوقِ ملامت پڑا ہے

یہ زندہ گڑا ہے

یہ مجسم ہے

ان دائمی اور سفاک سچائیوں کا
کہ چوتھوں نے کاغذِ جہاں کو عطا کیا

یہ مجسم ہے

ان بے غرضی جراتوں کا
جو تو نے ہر اک ناتواں کو عطا کیا

یہ کہتا ہے

اے دائمی حکمتوں کے پیہم

کہ انسان سب برابر ہیں

ان میں کوئی کم نسب کوئی بزر نہیں ہے

یہ کہتا ہے

الفاظ سب سے مقدس ہیں

اور حرف کی روشنی سے

کوئی نور بڑھ کر نہیں ہے

یہ سرکش

مقدر کو انساں کا راہوار کہتا ہے

آدم کو نقاش ہستی کا شہکار کہتا ہے

کیا کچھ یہ خام گنہگار کہتا ہے

اے روشنی کے پیمر

یہ شوریدہ سر

حرفِ زل ہے

کہ مخراب و منبر سے

فتوہ گروفتنہ پرواز دیں

حرفِ حق نیچتے ہیں

فقہانِ مسند نشین

حرص دینار و درہم میں

تیرے صحیفے کا اک اک ورق بیچتے ہیں

یہ خلقت کا تحول

اور اپنی جیبیں کا عرق بیچتے ہیں

پیغمبر

مجھے حوصلہ دے

کہ میں ظلم کی قوتوں سے

اکسیلا ٹرا ہوں

کہ میں اس جہاں کے جہنم کدے میں

اکسیلا کھڑا ہوں

سلام اس پر!

حسین !

اے پیکر سر بریدہ

بدن دریدہ

سدا ترا نام پر گزیدہ

میں کر بلا کے ہو ہوا دشت میں تجھے

دشمنوں کے ترغے میں

نیف در دست دیکھتا ہوں

میں دیکھتا ہوں

کہ تیرے سارے رفیق

سب ہمنوا

بھی جان فروش

اپنے سروں کی نعشیں کٹا چکے ہیں
 گلاب سے جسم اپنے خوں میں نہا چکے ہیں
 ہوئے جانکاہ کے یگوئے
 چراغ سے تانباک چہرے بجھا چکے ہیں
 مسافرانِ رہِ وفالت لٹا چکے ہیں
 اور اب فقط تو
 زمین کے اس شفقِ کدے میں
 ستارہ صبح کی طرح
 روشنی کا پرچم لئے کھڑا ہے

یہ ایک منظر نہیں ہے
 ایک داستان کا حقہ نہیں ہے
 اک واقعہ نہیں ہے
 یہیں سے تاریخ
 اپنے تازہ سفر کا آغاز کر رہی ہے

یہیں سے انسانیت
نئی رفعتوں کو پرواز کر رہی ہے

میں آج کسی کر بلا میں
بے آبرو - نگوں سر
شکست بخوردہ نخل کھڑا ہوں
جہاں سے میرا عظیم ہادی
حسین کل سرخرو گیا ہے

میں جاں بچا کر
فنا کے دلدل میں جاں بلب ہوں
زمین اور آسمان کے عز و فخر
سارے حرام بھیر
وہ جاں لٹا کر
منارۂ عرش چھو گیا ہے

سلام اس پر

سلام اس پر



گلیوں میں کیسا شور تھا کیوں بھیڑ سی مقتل میں تھی
کیا وصف اس شاعر میں تھا کیا بات اس پاگل میں تھی

ایسا ستم کیا ہو گیا اک راہر و تحف کھو گیا
پھر زندگی کی شام تھی اور شام بھی جنگل میں تھی

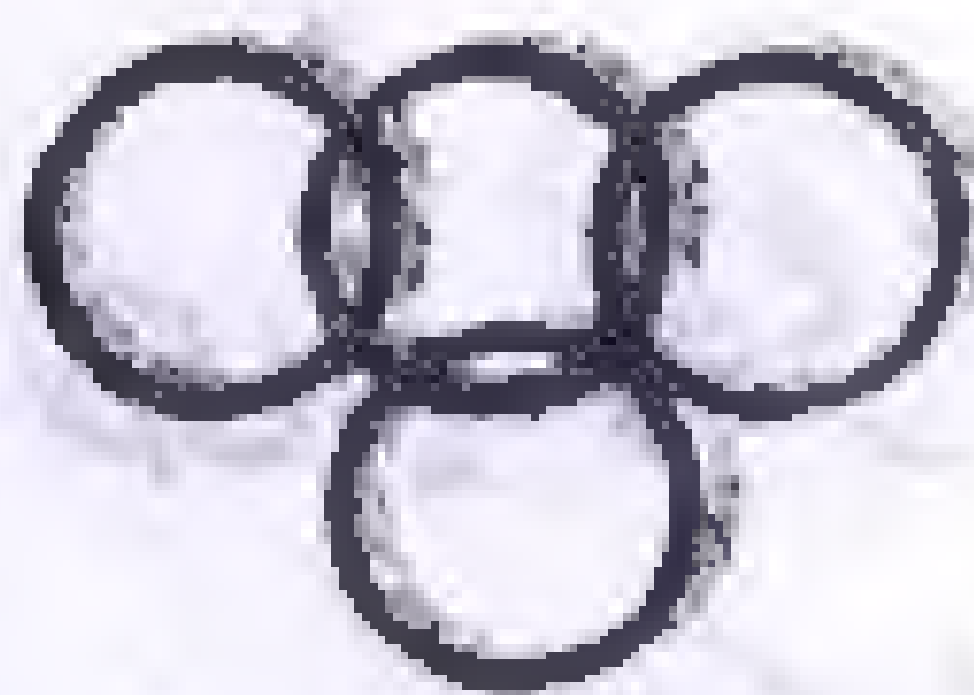
کیا کیا ہوا چلتی رہی ایہ کو مگر جلتی رہی
کیا زور اس آندھی میں تھا کیا تاب اس مشعل میں تھی

شعلہ بہ دل آتش جبال پھرتا رہا وہ بے اماں
ورنہ صبا زلفوں میں تھی ورنہ گھٹا کا جل میں تھی

ترسی ہوئی آنکھوں میں کُن کُن ساحلوں کے خواب تھے
پرکشتی عمرِ رواں حالات کی دلدل میں تھی !

خلقت نے آواز سے کسے طعنے دیئے فتوسے جڑے
وہ سخت جاں ہنستار ہاگو خودکشی پل پل میں تھی

اپنی کشیدِ جاں سے ہی پیتا رہا جیتا رہا
نشہ کہاں سا غریب تھا مستی کہاں بوتل میں تھی



طنز و مزاح کے شاعر
دلائل و افکار

کامیاب ترین مجموعہ کلام
مطالعہ عرض

ملنے کا پتہ

حسامی بک ڈپو
مچھلی کمان - حیدرآباد

گلزارِ عروض

دلدار

ملنے کا پتہ :
حسامی بکسٹو ڈپو

مچھلی کمان ، حیدرآباد ۲